ہم کیوں سیادت سے معزول ہوئے؟

ہم کیوں سیادت سے معزول ہوئے؟

راشد شاز

ملّی پبلی کیشنز، نئی دہلی ۲۵

سالِ اشاعت ۲۰۱۲ء

ISBN 978-93-81461-01-3

نامِ کتاب : ہم کیوں سیادت سے معزول ہوئے؟
مصنف : راشد شاز
اشاعت اول : ۲۰۱۲ء
قیمت : اسّی روپئے (Rs.80/-)
مطبع : گلوریس پرنٹرس، نئی دہلی۔۲

ناشر
ملّی پبلی کیشنز
ملی ٹائمز بلڈنگ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

Milli Times Building, Abul Fazl Enclave,
Jamia Nagar, New Delhi-25
Tel:. +91-11-26945499, 26946246
Fax: +91-11-26945499
Email:millitimes@gmail.com
www.barizmedia.com

بسم الله الرحمن الرحيم

ہم یہ چاہتے ضرور ہیں کہ وحی کی تجلی ایک بار پھر ہماری راہوں کو منور کر دے، بے سمت کارواں ایک بار پھر منزل کی طرف گامزن ہو جائے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم وحی کی طرف واپسی کے لیے تمام ترکیبیں علمائے متقدمین کے منہج سے مستعار لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اہلِ یہود کی طرح ہم نے بھی اپنے بزرگوں کی فہم وفراست کو ناقابل خطا باور کر رکھا ہے۔ ابتدائی نسلوں کے فیصلے اور ان کی فہم وبصیرت ہمارے درمیان وحی جیسے تقدس کی حامل ہو گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کے تازہ بہ تازہ مطالعے کو اپنے حدامکان سے باہر سمجھتے ہیں۔

فہرست

عرضِ ناشر	۹
ابتدائیہ	۱۳
ہم کیوں معزول ہوئے؟	۲۱
تعلیقات وحواشی	۶۱

ہمیں یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ بنی اسرائیل کی طرح امت مسلمہ بھی سیادت کے منصب سے مدت ہوئی محروم کی جا چکی ہے۔ دنیا میں سیاہ وسفید کے فیصلے آج جو اقوام کر رہی ہیں، وہ یقیناً ہم نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں زوال آہستہ آہستہ دبے پاؤں آیا ہے۔ چونکہ ہم عروج وزوال کو فتح وشکست کی سیاسی تاریخ سے ناپنے کے عادی ہو گئے ہیں اس لئے سقوط بغداد سے پہلے ہم زوال کا احساس بھی نہیں کر پائے۔

عرضِ ناشر

بعض کتابیں معلومات کا بیش بہا خزانہ ہوتی ہیں اور بعض اس سے بھی کہیں آگے معلومات کی چھان پھٹک کے بعد انہیں تحلیل و تجزیہ کے کام پر لگاتی ہیں۔ عام طور پر قاری کتابوں سے یہ توقع کرتا ہے کہ یہاں اس کی الجھنوں اور سوالوں کا جواب مل جائے گا لیکن اسے کیا کیجئے کہ قاری کے اسی رویے کے سبب بعض کتابیں مقدس بت کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں جو بالآخر فرقوں کی تشکیل اور ان کے استحکام کا سبب بن جاتی ہیں۔ مسلمانوں کے مختلف گروہ جو دین کی بنیادی تفہیم وتشریح کے مسئلہ پر مسلکوں، فرقوں اور جماعتوں میں بٹ گئے ہیں ان کی علمی اور فکری غذا کی فراہمی ان کتابوں کے ذریعہ ہوتی رہی ہے جو یا تو ان کے بانیان نے لکھی ہیں یا تاریخ کے مختلف ادوار میں ان کے اکابرین نے ان پر اپنی پسندیدگی کی مہر ثبت کی ہے۔ مسلمانوں کے ہر فرقہ کے پاس خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا اپنی پسندیدہ کتابوں کا ایک سیٹ موجود ہے جس نے اس کے فہم دین کو سہارا دے رکھا ہے اور جس کے سبب دوسرے فرقوں کے مقابلہ میں اس کا فکری اور نظری تشخص قائم ہے۔ کتابیں جب بت بن جائیں اور انسانوں کی تحریر پر جب سند کا گمان ہونے لگے اور یہ خیال عام ہو کہ ان کتابوں میں ہمارے سوالوں کا شافی اور حتمی جواب موجود ہے تو انسانی دل و دماغ پر تالے لاگ جاتے ہیں۔ شرک ایسی قوموں کا مقدر بن جاتا ہے اور پھر وہ فرقہ در فرقہ یعنی تقسیم در تقسیم کی راہ پر چل نکلتی ہے۔

خدا کی کتاب کے علاوہ کسی کتاب کا یہ مقام نہیں کہ ہم کسی شافی اور حتمی جواب کی تلاش میں اس

سے رجوع کریں۔ ہاں انسانوں کی تالیفات کو معاون کتب کی حیثیت سے یقیناً پڑھنا چاہیئے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ ان سوالات کی تلاش میں جو ہمیں درپیش ہیں دوسرے علماء و محققین برسہا برس کے غور و فکر کے بعد کن نتائج پر پہنچے ہیں اور یہ کہ انھیں اس سفر میں کتنی کامیابی مل سکی ہے تا کہ ہم وہاں سے اپنے فکری سفر کا آغاز کر سکیں اور ان غیر ضروری بحثوں سے بھی بچ سکیں جس میں خواہ مخواہ ہماری توانائی کے زیاں کا اندیشہ ہو۔

یہ کتاب جو آپ کے ہاتھوں میں ہے بنیادی طور پر کسی سوال کا جواب فراہم کرنے کے بجائے صرف سوال قائم کرتی ہے۔ ایسا اس لیے کہ اگر سوال اپنے تمام مالہ و ماعلیہ کے ساتھ مرصع ہو جائے اور قاری اس سوال کی تاریخ سے بھی واقف ہو تو یہ کام اس کے لیے زیادہ مشکل نہیں رہتا کہ وہ علم و آگہی کے سفر پر از خود صحیح سمتوں میں نکل پڑے اور اگر اس سفر میں اسے وحی ربانی کی مشائیت حاصل ہو تو نامرادی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ادراکِ زوالِ امت جب پہلی بار ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی تھی اس وقت ہمیں اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ ایک خالص علمی تصنیف کو عوام و خواص میں اس قدر پذیرائی مل سکے گی۔ البتہ دیکھتے دیکھتے جب اس کے دو ایڈیشن ختم ہو گئے تو اس بات کا اندازہ ہوا کہ ان سوالات میں دلچسپی صرف طبقۂ علماء کی نہیں بلکہ عامۃ الناس کی بھی ہے جن کی طرف سے اس کتاب کے مختلف ابواب کی علیحدہ علیحدہ اشاعت کا تقاضا مسلسل کیا جاتا رہا لیکن مصنف کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ یہ تمام ذیلی بحثیں دراصل ہماری سیادت کی معزولی کے اسباب کی تلاش سے متعلق ہیں اس لیے خطرہ ہے مبادا مختلف اجزاء کی علیحدہ اشاعت اصل مرکزی سوال سے ہماری توجہ ہٹا دے۔ البتہ اب ادراک دوم کی اشاعت کے بعد اور اسی سلسلہ کی ایک اور تالیف کتاب العروج کی طباعت کے بعد جب یہ بحث اب کسی قدر اپنے اختتام کو پہنچی ہے، شائد اب ان ابواب کی علیحدہ اشاعت اس مرکزی سوال کو مجروح کرنے کا سبب نہ بنے۔ ایک دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ ادراک کی دو مجلدات کی غیر معمولی ضخامت کے سبب قارئین کا حلقہ اب تک محدود رہا ہے سو ان اجزاء کی اشاعت سے امید ہے کہ یہ تحریریں وسیع پیمانے پر پہونچیں گی پھر جن لوگوں کو ان مسائل سے واقعی دلچسپی ہوگی وہ یکجا ان مسائل پر غور و خوض کے لیے اصل سلسلۂ تصنیفات سے رجوع کی زحمت گوارا کریں گے۔

ادراک کی جلد اول کا عربی ترجمہ کوئی پانچ سال پہلے دارالحکمۃ، لندن سے شائع ہوا تھا اس کے علاوہ مصنف کی دوسری کتابوں کے عربی تراجم بھی لندن، بیروت اور ریاض کے بعض ناشرین نے شائع کیے تھے۔ یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ ان سوالوں کی تلاش میں عالمِ عرب کے علماء بھی کم مضطرب نہیں۔ بعض سعودی جامعات نے مصنف کی منہجِ فکری پر باقاعدہ مقالے تحریر کیے اور بعض اخبارات ورسائل میں اس علمی منہج کی عمومی پذیرائی کی گئی۔ عالمِ عرب جو اس وقت بیرونی سازشوں کی زد میں ہے اس بات سے خاصا مضطرب ہے کہ اس کی شکست کا سامان کہیں اور نہیں اس کے اندرون میں پوشیدہ اور پیوست ہے۔ شیعہ سنی کے مابین مسلسل وسیع ہوتی ہوئی خلیج ہم سے مسلسل اس بات کی طالب ہے کہ مسلک پرستی اور فرقہ بندی پر مبنی زوال زدہ اسلام کے مقابلے میں متحدہ پیمبرانہ اسلام کی از سرِ نو تشکیل کا وقت اب آ پہنچا ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ میں اس بات کا خیال رہے کہ یہ ایک طویل سلسلۂ تالیف کا ایک باب ہے گو کہ یہ خود اپنی جگہ مکمل ہے لیکن اس بحث سے پوری طرح استفادے کے لیے لازم ہے کہ ہم ادراک کی دونوں جلدیں اور کتاب العروج کے باقاعدہ مطالعہ کے لیے خود کو ذہنی طور پر آمادہ کریں۔ یاد رکھیے! امت کے احیاء کے لیے نبی کے علاوہ کسی فردِ واحد کی بصیرت کافی نہیں ہو سکتی۔ یہ تحریریں اس خیال سے لکھی گئی ہیں کہ امت کے دردمندوں اور اہلِ فکر کو اجتماعی غور وفکر کی دعوت دی جا سکے۔ ہم نے ان تین جلدوں میں مسلمانوں کی تہذیبی اور علمی تاریخ کی وہ ضروری معلومات فراہم کر دی ہیں جو اس مسئلہ پر غور وفکر میں ہماری معاون ہو سکتی ہیں۔ اگر ہمیں یہ علم ہو کہ ہم جس مسلک پر سختی سے کاربند ہیں اور جسے دین کی واحد مستند تعبیر سمجھے بیٹھے ہیں وہ وحی سے کہیں زیادہ تاریخ کی پیداوار ہے تو ہمیں اپنی شدت پسندی پر لگام دینے میں مدد مل سکتی ہے۔ اور کیا عجب کہ ہمارا یہ احساس اصل متحدہ پیمبرانہ اسلام کی بازیافت کا نقطۂ آغاز ہی بن جائے۔

☆ ☆ ☆

ہمارے زوال کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ قرآن مجید میں اہل یہود کے واقعہ عبرت کے باوجود ہم بدقسمتی سے اسی راستے پر چل نکلے ہیں۔ اور چونکہ اللہ کا قانون اٹل ہے ﴿ولن تجد لسنة الله تبديلا﴾ اس لیے ہم بھی اہل یہود کی طرح منصب سیادت سے معزول کردیے گئے ہیں۔ بس ہم میں اور اہل یہود میں فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے یہاں وحی ربانی، انسانی تشریح و تعبیر اور فقہی تحلیل و تاویل میں اس طرح مسخ ہوگئی تھی کہ ایک کا دوسرے سے الگ کرنا مشکل تھا البتہ ہمارے یہاں وحی اپنی اصلی شکل میں اب بھی محفوظ ہے۔

ابتدائیہ

صدیوں سے ہم زوال کے گردابِ شر میں گرفتار ہیں۔ تاریخ جس کی مٹھی میں ہو بدقسمتی سے اب وہ ہم نہیں۔ لیکن اس تلخ اور دل گرفتہ حقائق کو تسلیم کرنے کا ہم میں یارا نہیں۔ جب تک زوال کی ہلا مارنے والی شدت کا احساس نہ ہو اس کے جملہ ابعاد کا نہ تو ادراک ممکن ہے اور نہ ہی اس اذیت ناک صورتحال سے نجات کی کوئی مضطربانہ تحریک ہی پیدا ہوسکتی ہے۔ گذشتہ کئی صدیوں سے ہمارے مفکرین ہمارے زوال پر کلام کرتے رہے ہیں جس سے یہ احساس تو عام ہوتا رہا کہ کہیں کوئی چیز کھوئی گئی ہے لیکن وہ گڑبڑی کہاں واقع ہے اس کی نشاندہی کی سنجیدہ کوششیں بہت کم نظر آتی ہیں۔ بغداد اور غرناطہ کے سقوط کے بعد سے اب تک اسباب زوال پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اتنا کم ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے اہل دانش رأس المسئلہ سے اپنا دامن کیوں بچاتے رہے۔ پھر ان تحریروں کی حیثیت بھی بے ربط تبصروں سے زیادہ نہیں۔ مذہب جب علمائے سابقہ کی تقلید قرار پائے اور یہ سمجھا جانے لگے کہ پچھلوں نے غور و فکر کا تمام کام انجام دے ڈالا ہے، دینی زندگی کے آسان فارمولے اب فقہاء کے دبستانوں سے حاصل کیے جاسکتے ہیں تو اس تقلیدی ذہن سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے متقدمین کے سرمائے کا تنقیدی محاکمہ کرسکے گا۔ جب یہ سمجھا جانے لگے کہ پچھلوں نے اپنی تحریروں میں وحی ربانی کا تمام تر عطر کشید کرلیا ہے تو بھلا قرآن مجید کو از سر نو کھولنے اور اس کی روشنی میں اپنے تہذیبی اور مذہبی سرمائے کے محاکمے کا خیال کیوں کر پیدا ہوسکتا تھا۔ کہنے والوں نے ضرور کہا

کہ ہمارا زوال دین سے انحراف کی وجہ سے عمل میں آیا ہے۔ دین کی طرف دوبارہ واپسی ہمیں از سرِنو منصبِ سیادت پر فائز کردے گی۔ اصولی طور پر اس جواب کی تمام تر صحت کے باوجود ہم یہ بتانے سے قاصر رہے کہ رجوع الی اللہ والرسول کا یہ عمل آج کی دنیا میں کس طرح انجام پا سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہم تخصیص کے ساتھ اس خرابی کی نشاندہی نہیں کر سکے جو منصبِ کارِنبوت سے ہماری معطّلی کا سبب بنی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ صدیوں سے دین کی طرف واپسی کی شدید خواہش اور اپنی گمشدہ عظمت کی بازیابی کی تمام تر کوششوں کے باوجود ہم آج بھی زوال کے گرداب بے کنار میں پوری طرح گرفتار ہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو آنے والا لمحہ ہمارے بے سمت کارواں کو اپنی اصل منزل سے مزید دور کرتا جاتا ہے۔

ہم یہ چاہتے ضرور ہیں کہ وحی کی تجلی ایک بار پھر ہماری راہوں کو منور کردے، بے سمت کارواں ایک بار پھر منزل کی طرف گامزن ہوجائے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم وحی کی طرف واپسی کے لیے تمام ترکیبیں علمائے متقدمین کے منہج سے مستعار لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اہلِ یہود کی طرح ہم نے بھی اپنے بزرگوں کی فہم وفراست کو ناقابل خطا باور کر رکھا ہے۔ ابتدائی نسلوں کے فیصلے اور ان کی فہم و بصیرت ہمارے درمیان وحی جیسے تقدس کی حامل ہوگئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کے تازہ بہ تازہ مطالعے کو اپنے حدامکان سے باہر سمجھتے ہیں۔ وحی ربانی کے گرد مفروضہ سلف صالحین کا گھیرا اتنا سخت ہے کہ صدیوں سے ہم نے عملی طور پر قرآن مجید سے راست رہنمائی کے تمام دروازے بند کر رکھے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے تہذیبی اور علمی سرمائے کو قرآن مجید سے بھی کہیں زیادہ اہمیت دینے لگے ہوں ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ ہم صدیوں پر مشتمل فکری بحران کے سخت لمحات میں بھی کتاب ہدایت کو منجمد کرنا تو گوارا کرلیں لیکن ہمارے لیے یہ قابل قبول نہ ہو کہ ہم اسلاف کی فہم کو خیرباد کہہ سکیں۔ حالانکہ ابتدائی صدیوں میں ہی دانش یونانی، ہندایرانی فلسفوں اور قدیم رہبانیت کے زیراثر مسلم فکر میں جو بحرانی کیفیت پیدا ہوئی تھی اور جس نے بالکل ابتدائی صدیوں میں ہمارے یہاں تاریخ اور وحی کے سلسلے میں سنگین نوعیت کے سوالات پیدا کردیئے تھے ہم اس کے اسرار و عواقب سے بھی ناآشنا نہیں۔ فتنۂ قتل عثمان سے لے کر عباسی بغداد کی جاہ وحشمت تک ہم محورِ وحی سے مسلسل باہر آنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اجنبی تصورات کے زیراثر اسلام جیسے الوہی

اور ابدی کلمہ کو تہذیب کی جلوہ نمائیوں میں دیکھنے کی کوشش ہونے لگی۔ اسلام کے بجائے اسلامی تہذیب ہماری شناخت کا حوالہ بنتی گئی۔ اس طویل عرصے میں سلف صالحین سے کہیں زیادہ اجنبی علوم وثقافت سے متاثر اہل فکر اجنبی paradigm میں فہمِ وحی کی سنجیدہ اور غیر سنجیدہ کوشش کرتے رہے۔ کوئی دانش یونانی کا اسیر ہوا تو کسی نے قدیم رہبانیت کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کی ناکام کوشش کی، کوئی ان التباساتِ فکری کی اصلاح کے لئے تاریخ سے مدد کا طالب ہوا تو کوئی اس نتیجہ پر پہنچا کہ ضرورت تشریح وتعبیر اور مباحث سے کہیں زیادہ ایک بدوی رویے کی ہے۔ فکری بحران کے اس دور میں اتنے بہت سارے رویے ان حضرات کی اپنی فہم وبصیرت کی مرہونِ منت تھے۔ کسی ایک رویے کی مکمل صحت پر یقین کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم دوسرے رویوں سے یکسر دست بردار ہو جائیں۔ گویا کسی مسئلہ پر اگر خود سلف صالحین باہم متصادم ہوں تو ان سبھوں کو بیک وقت صحیح قرار دینے کے غیر عقلی موقف کے بجائے مناسب ہوگا کہ ہم ان تمام رویوں کا وحی کی روشنی میں محاکمہ کریں تا کہ ہمارے لئے متقدمین کے التباسات کو سمجھنا آسان ہو اور ہم وحی سے راست اکتساب کے لیے پچھلوں سے کہیں زیادہ پر اعتماد دکھائی دیں۔ اور یہ تبھی ممکن ہے جب آج کا انسان خود اپنے آپ کو وحی کا مخاطب قرار دے اور اسے، جیسا کہ اقبال نے کہا ہے، ایسا محسوس ہو گویا قرآن مجید پچھلی نسلوں کے لئے ہی نہیں نازل ہوا تھا بلکہ خود اس کے قلب پر اس کا نزول ہو رہا ہے۔ قرآن کا مخاطب جب تک اس اعتماد سے سرشار نہ ہو وہ متقدمین کے التباساتِ فکری سے اپنا دامن نہیں بچا سکے گا اور قرآن مجید کی طرف اس کی واپسی کی تمام خواہش قدیم تعبیرات کے حصار میں دم توڑ دے گی۔

وحی کی بازیافت کے بغیر ہمارے جاری زوال پر بندھ باندھنا ممکن نہیں۔ یہی وہ رأس المسئلہ ہے جس پر حیرت انگیز طور پر ہمارے اہل فکر نے بہت کم توجہ دی ہے۔ وحی سے ہماری غفلت کوئی تازہ بہ تازہ phenomenon نہیں۔ اس کی ابتداء تو اسی وقت ہوگئی تھی جب قراء کے مقابلے میں حفاظ حدیث کا سماجی مرتبہ بلند ہونے لگا تھا۔ آثار واقوال کی ترتیب کے دوران تاریخ کے سلسلے میں ہمارے بدلتے تصورات نے قرآن مجید کی طرف ہمارے رویے میں تبدیلی پیدا کی۔ بہت جلد دانش یونانی کے زیر اثر غیر قرآنی مباحث اور طویل طولانی قصوں نے تفسیری حواشی میں اپنی جگہ بنالی۔ قرآن مجید پر وقفہ وقفہ سے حجابات کی پرتیں کس طرح پڑتی گئیں رأس المسئلہ کو سمجھنے کے لئے ان کا

مطالعہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ حدتو یہ ہے کہ صدیوں کی تفسیری کاوشوں کے باوجود آج بھی قرآن مجید کو بحیثیت کتابِ عمل قبول کیا جانا باقی ہے۔کل اگرخلق قرآن کے مسئلہ نے ہماری تمام تر دانشورانہ توانائیوں کو اپنی طرف مرکوز کر رکھا تھا تو آج ہم قرآن کے اعجاز علمی (یعنی اس کے اندر پائے جانے والے سائنسی حقائق) کو غایتِ وحی قرار دیئے بیٹھے ہیں۔ ہرعہد کے پیدا کردہ رجحانات والتباسات کی روشنی میں مطالعۂ قرآنی کی یہ روش غایتِ وحی کو شکست دیتی رہی ہے۔ ہمارا فکری کارواں جو عہدِ عباسی میں اپنے اصل راستے سے دور جا پڑا تھا آج بھی واپسی کا منتظر ہے۔ جب تک وحی کو غایت وحی کے تناظر میں سمجھنے کا چلن عام نہ ہو قرآنی مطالعات کے بے مغز علمی مباحث ہماری مدد کرنے سے قاصر رہیں گے اور ہمارے ذہنوں میں اسلام کا مفہوم عباسی بغداد کے شوکت اسلام سے خلط ملط ہوتا رہے گا۔

امت مسلمہ کے زوال کا مطالعہ کسی قوم کے زوال کے بجائے ایک تصور حیات کے زوال کی حیثیت سے کیا جانا چاہیئے جبھی یہ ممکن ہے کہ ہم زوال کے جملہ ابعاد کو مستحضر کر سکیں۔ اسلامی تہذیب ایک گمراہ کن اصطلاح، ایک خیال عبث (false metaphor) ہے۔ اسلام کو کسی مخصوص تہذیبی قالب میں برتا جانا ممکن نہیں۔ ایک آفاقی پیغام کو کسی نسلی، لسانی یا مقامی ثقافت کا اسیر نہیں بنایا جا سکتا۔ جو لوگ عباسی بغداد کو اسلامی تہذیب کا عہد زریں قرار دیتے ہیں وہ دراصل عہد رسول کی مدنی ثقافت کی عظمت سے ناآشنا ہیں۔ ان کی نگاہیں جاہ وحشم کے سطحی مظاہر میں الجھ کر رہ گئی ہیں۔ اسلام عرب امپائر کے قیام کے لئے ہرگز نہیں آیا تھا۔ ہاں عملی طور پر یہ ہوا ضرور ہے کہ امپائر بلڈنگ کے عہد میں ہمارے اہل فکر کی ایک قابل ذکر تعداد نے حکمرانوں کے جذبہ توسیع پسندی کو اسلامی جواز فراہم کرنے کی کوشش کی۔ منحرف سیاسی قیادت اور امام غیر عادل کی رہنمائی میں اسلام کے نام پر ریاست کی ترتیب وتنظیم اور اس کی توسیع وغلبہ کے جو مظاہر دنیا نے دیکھے ہیں اس سے یہ تاثر عام ہوا ہے کہ اسلام، انسانیت کی عمومی رہنمائی سے کہیں زیادہ، مسلم قوم کے غلبہ کی شاہ کلید ہے۔ اسلام کا یہ تہذیبی رنگ وروپ اس مدنی قالب سے میل نہیں کھاتا جو صرف کلمۂ (تقلیب انگیز خیال) سے عبارت تھا جس کے پیچھے قوموں کی کوئی تاریخ نہ تھی اور جس نے وقت کے نام نہاد اہل ایمان (یہود ونصاریٰ) کی جھولی میں اپنا وزن ڈالنے کے بجائے یہ کہہ کر ان سے اپنا دامن چھڑا لیا تھا کہ ﴿صبغة اللہ

و من احسن من الله صبغة﴾۔

مسلمِ حنیف بننے کی یہ دعوت اور **کونوا ربانیین** کا سحر انگیز آفاقی نعرہ غایت وحی سے عبارت تھا، اس کی بنیادیں وحی کے اندرون میں تھیں۔ وحی سے متاثر یا اس کی سرحدوں پر پائی جانے والی ثقافت میں نہیں۔ تب **کونوا ربانیین** کی ہر دعوت کسی تہذیبی شناخت سے نہیں بلکہ فکر و عمل میں تبدیلی سے عبارت تھی۔ مسلم حنیف بننے کا عمل تمام تہذیبی سرحدوں سے پرے ایک ایسا آفاقی خیال سمجھا جاتا تھا جس نے انسانی اجتماعی زندگی کے تمام سابقہ تصورات کو باطل قرار دے ڈالا تھا۔ تقلیب انگیز کلمہ کی بنیاد پر وجود میں آنے والا مسلمِ حنیف ایک ایسا شخص تھا جسے صحیح معنوں میں کائناتی شہری کہا جا سکے۔ تب مسلم حنیف بننے کی ہر دعوت بندوں پر عبودیت کے لامتناہی امکانات وا کرتی تھی۔ فارس کے سلمانؓ اور حبشہ کے بلالؓ، ابوبکرؓ و عمرؓ کی طرح اپنے آپ کو اس فکری قبیلہ کا فرد سمجھتے تھے جس کی بنیادوں میں عرب و عجم، سیاہ و سفید اور رنگ و نسل کی مروجہ روایات کا کوئی دخل نہ تھا۔ ﴿**ان اکرمکم عندالله اتقاکم**﴾ کے عملی مظاہر نے اسلام کو ایک رویے کے طور پر متعارف کرایا تھا شناخت کے طور پر نہیں۔ تب اسلام ایک ایسا کھلا دروازہ تھا جہاں گم گشتہ انسانیت کے قافلے جوق در جوق داخل ہوتے اور ہر شخص اپنی بساط بھر اپنے لئے سپردگی کے امکانات وا پاتا۔ حتیٰ کہ جن لوگوں نے دین کو institutionalize کر رکھا تھا یا جو دین کی آفاقیت کو فرقۂ موسوی یا عیسوی سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا تھے انھیں بھی ایک آفاقی معاشرے کے قیام میں کھلے عام شمولیت کی دعوت دی گئی ﴿**یا اهل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم**﴾ گویا ایک صلائے عام تھی۔ زندہ ضمیر جہاں بھی ہوا سے دعوت دی گئی کہ رنگ و نسل سے ماوراء، قبائلی اور ثقافتی شناخت سے پرے، سپردگی کی بنیاد پر وحدت انسانیت کا جو قافلہ چل نکلا ہے اس میں شریک ہونے سے وہ محروم نہ رہ جائے۔ وحی کا یہ امید افزا آفاقی پیغام ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہر قسم کے ناہنجاروں، گنہگاروں کو اپنی آغوش رحمت میں لے لے گا۔ تب وحی ربانی باب مغفرت کا احساس دلاتی، دروازہ کھلے ہونے کا احساس مایوس ڈوبتے نفوس میں بھی امید کی جوت جگاتا۔ البتہ جب سے اس کتاب ہدایت کو کتاب قانون یا کتاب فقہ کے طور پر پڑھنے کا رواج پیدا ہوا اور ہمارے شارحین عملی طور پر ﴿**و قالوا کونوا هودا او نصاریٰ**﴾ کے نقیب بن گئے، ہم ربانین یا مسلم حنیف بنانے کے بجائے ساری توجہ وقت کا یہود و نصاریٰ یعنی مروّجہ

مسلمان بنانے پر صرف کرنے لگے۔ اسلام رویے کے بجائے شناخت کی حیثیت سے متعارف ہوتا گیا۔ قرآن کی فقہی تعبیر نے اسلام کے سلسلے میں صرف دوسروں کو بند دروازہ ہونے کا احساس نہیں دلایا بلکہ ملت اسلامیہ کا اندرونی ڈھانچہ بھی سخت انتشار وافتراق کا شکار ہوگیا۔ اہل کلمہ کے ایک گروہ نے دوسرے گروہ کی تکفیر کو عین خدمت اسلام قرار دیا اور تلبیس وتکفیر کے اس ہنگامے میں یہ پتہ لگانا مشکل ہوگیا کہ واقعی مسلمان کہلائے جانے کا حقدار ہے کون؟ صدیاں گزریں بنیادی عقائد کے سلسلے میں فقہاء کوئی متفقہ محضر نامہ پیش کرنے میں ناکام رہے۔ مختلف عہد میں عقیدے کی مختلف کتابیں اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ قرآنی دائرۂ فکر سے باہر دانشِ فقہ کے حصار میں کامل سپردگی کا وہ ایجنڈہ کس طرح کھویا گیا۔ ایک طرف تو قرآن کی یہ تلقین کہ ﴿**ان اللہ یفصل بینھم یوم القیامة**﴾ اور دوسری طرف مختلف فرقوں کے ذریعے مرتب کیے جانے والی کتب عقائد کا یہ اصرار کہ مسلمان ہونے کے لیے ان بیانات کو قبول کرنا لازم ہے۔ علماء جب خود کو وحی کا طالب علم سمجھنے کے بجائے religious authority قرار دے ڈالیں تو ان التباسات کا پیدا ہونا فطری ہے۔

وحیٔ ربانی جو عہد رسول میں منتشر اور متفرق انسانیت کو وحدت میں پروتی تھی' جو برملا اس بات کا اعلان کرتی تھی کہ تمام سابقہ پیغمبر اور ان کے قدسی صفات متبعین ایک ہی خانوادۂ توحید کے فرد ہیں۔ ابراہیم ویعقوب اور ان کے نبوی خانوادوں کا سلسلہ ہو یا بنی اسمٰعیل کے سلسلے سے تعلق رکھنے والا یہ نبی، یہ سب کے سب ان ہی قدسی صفات سپرد کردہ نفوس کی جگمگاتی کہکشاں ہیں۔ جو لوگ قدسیوں کے اس کارواں میں شامل ہونا چاہتے ہوں ان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ سابقین مسلم حنفاء سے لاتعلقی کا اظہار کریں۔ ﴿**لانفرق بین احد من الرُّسله**﴾ کے بیان نے ہر قوم اور ہر خطّے کے مسلم حنیف کو ایک وحدت میں پرو دیا تھا۔ اہل یہود کا نسلی تفاخر یا اہل نصاریٰ کا یہ دعویٰ کہ نجات صرف ان ہی کے فرقے سے وابستہ ہوجانے میں ہے، اس آفاقی دعوت کے تناظر میں اپنا وزن کھو چکا تھا۔ قرآن کا اصرار تھا کہ یہ نبی کوئی نئی دعوت یا نیا دین لے کر نہیں آیا اور نہ ہی اسے کسی نئی امت کی تشکیل مقصود ہے بلکہ اس کا کام دین براہیمی کا احیاء ہے۔ وہی ابراہیم جو ہر دور کے مسلم حنیف کے لئے ایک لائق اتباع مثال ہے۔ قرآن کا یہ انداز تخاطب مختلف فرقوں اور گروہوں میں پائے جانے والے مسلم حنیف کو جوڑنے کی ایک کامیاب کوشش تھی جس کی قیادت پر اب تاریخ کے آخری لمحے

تک محمد رسول اللہ کو فائز کیا گیا ہے۔ ۲۳ سالوں کی مختصر نبوی زندگی کی حیرت انگیز کامیابی کی کلید اسی وسیع النظر قرآنی فکر میں ہے۔

یہ کتاب بنیادی طور پر اسی صورتِ حال کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں کس طرح رفتہ رفتہ وحی کے بجائے متعلقاتِ وحی کو اس قدر اہمیت ملتی گئی کہ مسلم حنیف ہونا بڑی حد تک ایک تہذیبی شناخت بن کر رہ گیا۔ وہ کتاب جو ﴿ھدی للمتقین﴾ کے دعوے سے شروع ہوتی ہے اس پر فقہاء کی تعبیرات نے، ایسا محسوس ہوا، دوسری ثقافت کے متقین کے لئے دروازہ بند کر دیا ہو۔ وحیٔ ربانی کی خالص فقہی تعبیر اور پھر اس تعبیر کو مغز دین قرار دینے کے نتیجے میں بہت جلد یہ آفاقی امت جسے سیادت عالم کے منصب پر فائز کیا گیا ہے، فرقۂ محمدی کی نفسیات میں محصور ہوگئی۔ مسائل عالم سے اپنا رخ موڑ کر اور عام انسانیت کی فلاح سے دست بردار ہو کر ہماری تمام تر توجہ ایک مخصوص ثقافتی شناخت والی امت مسلمہ پر مرکوز ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ ہمارے فقہاء نے دنیا کو اسلامی اور غیر اسلامی سرزمین میں بانٹ ڈالا اور ایسا محسوس ہوا کہ مسلم آبادی کے علاقوں کے علاوہ دنیا کے دوسرے خطوں کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ سیادت عالم سے ہماری کنارہ کشی دراصل وحی کے سلسلے میں گمراہ کن تعبیرات سے پیدا ہوئی تھی۔ صدیاں گزریں وحی پر پڑنے والے حجابات میں اضافہ ہوتا رہا۔

ہم جب تک پچھلی غلطیوں کو درست نہیں کرتے ہمارا اگلا ہر قدم مزید التباسات کو جنم دے گا۔ کوئی گیارہ سو عرصے پر محیط ہمارا فکری سفر اس خیال کی توثیق کرتا رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان التباسات کی پیدا کردہ ہولنا کیوں کا فی الفور ادراک کریں کہ ایسا کرنا ہمیں اس گرداب شر سے نکلنے کے لئے مضطرب کر دے گا اور پھر جیسا کہ اللہ کا وعدہ ہے ﴿**والذین جاھدوا فینا لیھدینھم سبلنا**﴾ ہم اپنے لئے امکانات کی نئی وادیاں وا پائیں گے۔

راشد شاز

جب تک کہ ہم اپنی تاریخ کے سلسلے میں ایک غیر جانب دارانہ اور غیر معتقدانہ رویہ پیدا نہ کریں، ہمارے لئے اپنی تاریخ کی بھیانک غلطیوں کا ادراک ممکن نہ ہوگا۔ اور جب تک ہم متقدمین کی تاریخ شناسی، عملی اور علمی زندگی میں ان کی دانش اور تفقہ کے سلسلے میں معتقدانہ رویہ ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے، اسباب زوال کو سمجھنے کی ہماری تمام تر کوشش احمقوں کی نئی جنت آباد کرنے کے مترادف ہوگی۔

ہمارے لئے صرف زوال کے اسباب دریافت کرنا ہی کافی نہیں بلکہ ہمیں یہ بھی بتانا ہوگا کہ فی زمانہ ہمارے پاس عہد رسول کو ازسرِ نو متصور کرنے کا طریقۂ کار کیا ہوگا اور اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہوگئے تو اسے اپنے متقدمین کے مقابلے میں زوال وانحراف کے سابقہ تجربات سے کیسے بچا سکیں گے؟

ہم کیوں معزول ہوئے؟

﴿اَللّٰــهُمَّ أَرِنِي الأَشْيَاءَ كَـمَا هِيَ﴾

قوموں کے عروج وزوال میں کلمہ یعنی نظریے کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ امت مامور سے امت معزول تک پہنچنے میں بنی اسرائیل پر کیا گزری، وہ کن آلام ومصائب کا شکار ہوئے اور کس طرح دنیا کی منتخب ترین امت پر ذلت کا عذاب مسلط کر دیا گیا، اس کی بڑی دردناک تفصیل قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں میں بیان کی گئی ہے۔ تاریخ انتہائی اعلیٰ اور مرتفع سطح پر اپنی تمام تر ابعاد کے ساتھ یہود ونصاریٰ کے حوالے سے ہم پر منکشف کر دی گئی ہے تاکہ ہم جو آخری امت مامور ہیں اپنے تاریخی سفر میں اس سے عبرت اور بصیرت حاصل کر سکیں۔ قرآن میں امم سابقہ اور بالخصوص اہل یہود کا تذکرہ جس تفصیل سے آیا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کی حیثیت سابقہ امت مامور کی ہے۔ ثانیاً بنی اسرائیل کو تمام عالم پر برگزیدگی اور بزرگی کا شرف حاصل رہا ہے۔ لیکن اس مقامِ مخصوص کو اور اپنے رب کی بے پایاں نعمتوں کی ناقدری کے نتیجے میں ان کی گرفت جس طرح سختی سے کی گئی ہے اس میں یہ سبق پوشیدہ ہے کہ محبوب ترین لوگ بھی اپنے اعمال کی وجہ سے مغضوب ترین لوگوں میں شامل ہو سکتے ہیں کہ خدا کے یہاں برگزیدگی کا پیمانہ عمل ہے، نسلی رشتے اور تفاخر نہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب اپنے رب کے حضور اپنی ذرّیت کا سوال رکھا تو وہاں بھی یہ بات صاف

کر دی گئی کہ شرف و کرم صرف ان کے لئے مخصوص رہے گا جو راہ حق پر گامزن رہیں، نافرمان لوگ، خواہ ان کا تعلق ذرّیت ابراہیمی سے کیوں نہ ہو، اللہ تعالی ان سے اپنی برأت کا اظہار کرتا ہے۔ بنی اسرائیل کے زوال وانحطاط کی داستان میں امت مسلمہ کے لئے اپنی تصویر کا دیکھ لینا اور اپنے موجود ہ زوال کے اسباب تلاش کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم قرآن کو کتاب تاریخ و آثار کے بجائے کتاب بصیرت وہدایت کی حیثیت سے پڑھیں۔ اور ان واقعات کا موارل سمجھنے کے لئے اپنے دل ودماغ کھلے رکھیں۔

ہمیں یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہئیے کہ بنی اسرائیل کی طرح امت مسلمہ بھی سیادت کے منصب سے مدت ہوئی محروم کی جا چکی ہے۔ دنیا میں سیاہ وسفید کے فیصلے آج جو اقوام کر رہی ہیں، وہ یقیناً ہم نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں زوال آہستہ آہستہ دبے پاؤں آیا ہے۔ چونکہ ہم عروج وزوال کو فتح وشکست کی سیاسی تاریخ سے ناپنے کے عادی ہو گئے ہیں اس لئے سقوط بغداد سے پہلے ہم زوال کا احساس بھی نہیں کر پائے۔ پھر سقوط بغداد کے بعد عالم اسلام میں جو نئے تہذیبی مراکز قائم ہوئے، اور عسکری فتوحات کا سلسلہ جس طرح جاری رہا، اس نے بھی ہمیں اس نظری التباس سے دوچار رکھا کہ ہم اب بھی امت مامور کے منصب پر فائز ہیں اور یہ کہ دنیا کا مستقبل ہم سے ہی وابستہ ہے حالانکہ شرع محمدی کی تصویر جس طرح رفتہ رفتہ بدل کر دین ملوکیت کی ہوگئی تھی اور جس طرح مشائخیت اور ملوکیت نے مسلم معاشرے پر اپنی گرفت سخت کر لی تھی ان حالات میں یہ صاف نظر آتا تھا کہ ایک نئی یہودیت دین محمدی میں اپنا مقام بنا چکی ہے۔کلمہ یعنی وحی ربانی جس کی تجلیوں سے معاشرہ منور ہوتا اور افراد کے قلب ونظر میں جھٹکے لگتے اب اسے مشائخیت کے قیل وقال نے جامد مذہب اور مردہ رسوم کی شکل دے دی تھی۔ کہنے کو تو کتاب محفوظ تھی لیکن اس پر تاریخ وروایات اور انسانی تشریح وتعبیر کا پہرہ اتنا سخت تھا کہ عام انسان یہی سمجھنے میں عافیت محسوس کرتا تھا کہ وحی سے براہ راست اکتساب فیض کا کام اگلے کر چکے۔ آسمان کے نیچے اب کوئی ایسا مسئلہ نہ رہا جس پر غور وفکر کرنا باقی رہ گیا ہو، یہ سمجھ لیا گیا کہ اولاً وحی ربانی سے براہ راست اکتساب کی ضرورت نہیں اور اگر اس کتاب تلاوت سے کسی کو طلب ہدایت مقصود ہی ہو تو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ متقدمین کی آنکھ سے اس کتاب کا مطالعہ کرے اور ان کے دماغ سے سوچے۔سلف کے فہم سے ذرہ برابر بھی انحراف

گمرہی پرمحمول کیا گیا۔ جوں جوں صدیاں گزرتی گئیں وحی کے گرد متقدمین کا حصار سخت ہوتا گیا۔ علوم وفنون کے غیرضروری مباحث اور فقہی موشگافیوں نے اس سرمایے میں اتنا اضافہ کردیا کہ عوام تو عوام خواص کے لئے اس حصار کا عبور کرنا ناممکن ہوگیا۔ وحی کے گرد انسانی تشریح وتعبیر کی مسلسل پڑنے والی گردنے کلمہ کو اس کی potential تسخیری قوت کے باوجود عملی طور پر اسے معطل کیے رکھا۔

ایک حدیث میں امت مسلمہ کے سلسلے میں یہ پیش گوئی کی گئی ہے کہ اس کا ارتقاء بہت کچھ اہل یہود کی طرح ہوگا۔ دونوں میں اتنی مشابہت ہوگی جتنی ایک ہی شخص کی دو جوتیوں میں ہوتی ہے۔ اس حدیث کی سند سے قطع نظر اس بیان سے کم ازکم اتنا تو سمجھ میں آتا ہے کہ جس عہد میں یہ حدیث سامنے آئی ہے اس عہد میں اہل فکر کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ بدقسمتی سے امت مسلمہ اہل یہود کے راستہ پر چل نکلی ہے۔ لیکن ہم جو روایتی تفسیروں میں مغضوب علیہم سے اہل یہود مراد لینے کے عادی ہیں۔ اس سادہ اصول کو نظر انداز کر گئے کہ اللہ کا غضب ہر اس امت کا مقدر ہے جس نے راہ راست کو ترک کر دیا ہو۔

ہمارے زوال کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ قرآن مجید میں اہل یہود کے واقعہ عبرت کے باوجود ہم بدقسمتی سے اسی راستے پر چل نکلے ہیں۔ اور چونکہ اللہ کا قانون اٹل ہے ﴿**ولن تجد لسنة الله تبديلا**﴾ اس لیے ہم بھی اہل یہود کی طرح منصب سیادت سے معزول کردیے گئے ہیں۔ بس ہم میں اور اہل یہود میں فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے یہاں وحی ربانی، انسانی تشریح وتعبیر اور فقہی تحلیل وتاویل میں اس طرح مسخ ہوگئی تھی کہ ایک کا دوسرے سے الگ کرنا مشکل تھا البتہ ہمارے یہاں وحی اپنی اصلی شکل میں اب بھی محفوظ ہے۔ انسانی تشریح وتاویل نے اس کے گرد جو حصار بنایا ہے اسے توڑنا گو کہ آسان نہیں البتہ خود اس کتاب محفوظ میں اس حصار کو توڑنے کا طریقہ موجود ہے۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے جو امت مسلمہ کو معزولی کے باوجود حاملین وحی کی حیثیت سے برقرار رکھتا ہے۔ اور یقیناً یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو اس وقت اس سرزمین پر کسی اور امت کو حاصل نہیں۔

بلاشبہ اہل یہود کی تاریخ میں ہمارے لیے بہت کچھ ہے۔ بسا اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اہل یہود کے تذکرے میں اپنے زوال کی داستان پڑھ رہے ہوں۔ اور ایسا فطری بھی ہے۔

البتہ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ دونوں کے یہاں فکری انحراف کا سفر تقریباً ایک ہی خطوط پر ہوا ہے۔کلمہ کے گرد انسانی قیل وقال کا حصار جس طرح اہل یہود نے قائم کیا بدقسمتی سے اسی عمل میں مسلمان بھی مبتلا ہوگئے۔اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ ابتدائے اسلام سے ہی یہودی علماء اسلام قبول کرتے رہے ہیں۔ان کے قبول اسلام کے محرکات خواہ کچھ بھی ہوں اس بات سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا کہ آنے والا اپنا تہذیبی ورثہ بھی ساتھ لاتا ہے۔ بالخصوص ایک ایسے مذہب میں جو یہودی اور عیسائی روایات کی تکمیل کے طور پر اپنے آپ کو پیش کرتا ہو۔اس میں یہودی اور عیسائی مآخذ سے استفادے کا رجحان عین فطری ہے۔اس لیے اسلامی نظریے کی تحلیل میں اہل کتاب کے علوم اور سابقہ ماخذ سے اکتساب فیض کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اسلامی نظریے پر یہودی اثرات تین سطحوں پر مرتب ہو رہے تھے۔اولاً یہودی علماء کی ایک قسم تو ان صادقین پر مشتمل تھی جس کی نمائندگی عبداللہ بن سلام جیسے برگزیدہ صحابی کرتے تھے۔اور جس کا اظہار ام المؤمنین حضرت صفیہؓ کی ان شہادات سے ہوتا تھا جو ایک یہودی عالم کی بیٹی کی حیثیت سے نئے دین کے بارے میں پیش کر رہی تھیں۔اس قبیل کے علماء کا وظیفہ یکسر مثبت تھا کہ وہ سابقہ صحف سماوی کی روشنی میں نئی رسالت کی تصدیق کر رہے تھے۔یہودی علماء کی ایک دوسری نسل ان لوگوں پر مشتمل تھی جن کے نمائندہ ناموں میں کعب بن احبار (متوفی ۶۵۲) اور وہب بن منبّہ (متوفی ۷۲۸) جیسے لوگوں کے نام آتے ہے۔اسلام تو یہ بھی لے آئے تھے اور مسلم معاشرے میں ان کی خدمات بھی مستحکم تھیں لیکن نئی وحی کو سمجھنے میں ان کی سابقہ معلومات برابر مداخلت کرتی رہتی تھیں۔ کعب بن احبار ایک یمنی یہودی تھے جو حضرت عمرؓ کے عہد میں داخل اسلام ہوئے تھے۔کہا جاتا ہے کہ بیت المقدس کے سفر میں آپ نے حضرت عمرؓ کی رہنمائی بھی کی تھی۔ان کی اس مسلمہ حیثیت کے باوجود فکر اسلامی کی تشریح وتعبیر کے سلسلے میں ان کی مساعی غیر متنازعہ نہیں تھیں۔خود عہد صحابہ میں یہودی مآخذات کی روشنی میں اسلامی نظریے کی تفہیم کے سلسلے میں آپ کی فہم پر انگلی اٹھ چکی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ابو ذرؓ نے بعض معاملات میں کعب کی تنبیہ کے لئے کوڑے بھی لگوائے۔لیکن مسلم تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں کعب ایک معتبر راوی کی حیثیت سے معروف رہے ہیں۔اسی طرح وھب بن منبہ بھی ایک نومسلم یمنی یہودی تھے۔اپنے عہد میں وہ یہودی اور عیسائی مآخذ پر سندِ

فضیلت کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان سے کتاب الاسرائیلیات بھی منسوب ہے جسے اہل کتاب سے متعلق علوم پر ایک مستند تصنیف قرار دیا جاتا ہے۔اس کتاب اور اس کے مصنف کا اسرائیلیات کے عام کرنے اور اسے اسلام کی تفہیم میں معاون لٹریچر کی حیثیت سے منوانے میں کلیدی رول رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں بھی یمن کے گورنر کے حکم پر کوڑے لگوائے گئے تھے۔ یہودی علماء کی تیسری نسل ان لوگوں پر مشتمل تھی جنھوں نے اس لیے اسلام قبول کرلیا تھا کہ اس کے بغیر حکومت کے اعلیٰ عہدوں تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔ عہد عباسی میں جب غیر عربوں کے لئے اہم عہدوں کا حصول ممکن ہوگیا تھا۔ یہودی علماء اور دانشوروں میں بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو نئے مذہب میں داخلے کے راستے سماجی اور سیاسی طور مراعات کے حصول میں کچھ حرج نہ سمجھتے تھے۔ یہودی علمی اور معاشی طور پر اس لائق تھے کہ وہ سیاسی تبدیلیوں سے فائدہ اٹھاسکیں۔اس قبیل کے لوگوں میں سب سے اہم نام یعقوب بن کلیث البغدادی (۹۹۱-۹۳۰) کا ہے جس نے فاطمیین کے مصر میں پالیسی ساز عہدہ حاصل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسماعیلی مذہب کے خدوخال طے کرنے میں اس کا کلیدی رول ہے۔ اسے اپنے عہد میں اسماعیلی فقہ پر سند کی حیثیت حاصل تھی۔

یہ بات بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو کہ ابتدائی عہد میں اسرائیلیات کے سلسلے میں مسلم علماء کا رویہ کسی قدر اثبات لیے ہوئے تھا۔ انبیاء کے قصے، کائنات کی تاریخ، تخلیق آدم کا واقعہ، فرشتوں کے بیان، اور اس قسم کے دوسرے موضوعات پر جو تفصیلات قرآن میں نہیں ملتی تھیں وہ بآسانی سابقہ کتب سماوی اور ان کی تشریحات میں مہیّا تھیں۔ ابتداء میں ان مآخذ کے سلسلے میں مسلمان علماء نے خاصی وسیع القلبی کا رویہ اختیار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہودی اور عیسائی مآخذ سے بہت سی تفصیلات ہماری تشریح وتعبیر کی کتابوں میں درآئیں۔اس طریقے نے خاص طور پر قرآن مجید کی تشریح وتعبیر کو متاثر کیا۔ آگے چل کر ان علوم کے سلسلے میں ایک تنقیدی رویہ پیدا ہوا لیکن ابتدائی چند صدیوں میں معلومات اور تفسیر قرآنی کا جو انداز اور اس سے احکام برآمد کرنے کا جو طریقہ رائج ہوگیا تھا اس کی تلافی ممکن نہ ہوسکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وحی کے گرد جس طرح اہل یہود نے تلمود کا حصار کھینچا تھا تقریباً اسی طرح ہم مسلمانوں نے بھی اسے تاریخ اور فقہ کا قیدی بنا دیا۔

تورات جو اہل یہود کی بنیادی کتاب ہے اور جس کے منزّل من اللہ ہونے پر خود قرآن گواہ ہے

اگر اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ محفوظ ہوتا تو اہل یہود کا منصب سیادت بھی محفوظ رہتا۔لیکن خدا کا یہ میثاق اہل یہود پر اتنا گراں گزرا کہ وہ اسے کتاب ہدایت تو کیا بناتے خود اس کے قابل عمل ہونے کے سلسلے میں شبہات کا شکار ہوگئے۔خمسہ موسوی (Torah Shebikhtab) میں خدائی احکام یہود کو اتنے سخت اور منجمد معلوم ہوئے کہ انہوں نے اس میں لچک پیدا کرنے کے لئے زبانی توراۃ (Torah Shebalpeh) کا عقیدہ گڑھ لیا۔ایک تورات سے دو تورات بنادی گئی۔ایک تو کتاب ہدایت تھی جسے اللہ نے نازل کیا تھا اور دوسری کتاب الامانی جو اہل یہود کی خواہشات کی پیداوار تھی۔کہا یہ گیا کہ موسیٰ کو تورات کی شکل میں تحریری حکم نامے تو ملے ہی تھے اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے چالیس دنوں تک زبانی بھی کچھ احکام دیے تھے جو بعد کے نبیوں اور علماء ومشائخ کی زبانی ہم تک پہنچے ہیں۔دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔اس لیے تحریری تورات کو زبانی تورات کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا۔ بعض اوقات زبانی تورات کو اللہ کی خاص نعمت بتادیا گیا جس کی روشنی میں تحریری تورات کے سخت گیر اصولوں میں لچک پیدا کرنا ممکن ہوسکا۔حالانکہ تورات جو الواح کی شکل میں تحریری طور پر موسیٰ کو عطا کی گئی تھی اور انہدام معبد کے بعد خمسہ موسوی کے مصنفوں نے اسے محفوظ کرنے کی کوشش کی تھی، ایک اور تحریری دستاویزی حقیقت تھی جبکہ زبانی تورات صدیوں کے زبانی اقوال، بزرگوں اور مشائخ سے سنی سنائی باتوں پر مشتمل تھے جس میں عام ربائیوں اور بزرگوں کے اقوال وافکار بھی شامل ہوگئے تھے۔لیکن اس تاریخی حقیقت کے باوجود تحریری اور زبانی تورات کو وحی کے دو ماخذ کی حیثیت سے قبول کرلیا گیا۔تورات خصوصیت کے ساتھ خمسہ موسوی کو قرار دیا گیا اور مشناۃ اور گمارا کو زبانی تورات کی دستاویزی حیثیت دے دی گئی[1] اس طریقۂ کار کا نتیجہ یہ ہوا کہ خمسہ موسوی انسانی فہم اور تاریخی بیان کے تابع ہوکر رہ گئی۔طُور پر موسیٰ کو جو اَلواح عطا کی گئی تھیں ان کی تعداد محدود تھی لیکن اس کی تفہیم کے لئے زبانی تورات کا جو عقیدہ قبول کرلیا گیا وہ صدیوں کے انسانی ورثۂ علم پر محیط ہو گیا۔آج یہودی فکر میں تلمود کے بغیر خمسہ موسوی کی تفہیم کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔خمسہ موسوی کے گرد تلمود کا یہ حصار اتنا سخت ہے کہ تحریری تورات زبانی تورات کے تابع ہوگئی ہے۔

اب ذرا امت مسلمہ کی خبر لیجئے جس کے یہاں آج بھی آخری وحی پوری آب وتاب کے ساتھ محفوظ ہے۔لیکن یہاں بھی وحی کے گرد مشناتی ادب کا وہی حصار ہے۔صدیوں میں اسلامی فکر نے

جوشکل اختیار کی اسے اسلاف کے مستند طریقۂ فہم سے تعبیر کیا جاتا ہے جس سے الگ کسی فہم کو اعتبار نہیں[۲]، ہمارے یہاں بھی وحی کی دوقسموں کا عقیدہ درآیا ہے۔ایک کو وحی متلواور دوسرے کو وحی غیر متلو قرار دیا گیا۔کہا گیا کہ وحی متلوقرآن کی شکل میں محفوظ ہے اور وحی غیر متلووہ احکام وفرامین ہیں جواللہ تعالیٰ نے قرآن کے علاوہ بھی محمد رسول اللہ کو بتائے تھے اور جس کے مستند مجموعے تیسری صدی ہجری میں محدثین کے ہاتھوں مرتب ہوئے اور جنہیں عرف عام میں صحاح ستہ یا کتب تسعہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔جمہور مسلمانوں میں اس عقیدے نے اپنی جگہ بنالی کہ وحی کا مکمل بیان صرف قرآن مجید میں نہیں ہے بلکہ اس سے باہر بھی بہت کچھ موجود ہے۔صوفیاء نے اس سلسلے کومزید طول دیتے ہوئے براہ راست رسول اللہ سے احادیث روایت کرنی شروع کردی[۳] گوکہ صوفی احادیث کوامت میں سند کی حیثیت حاصل نہیں ہوسکی۔البتہ احادیث کے انسانی مجموعے کے سلسلے میں یہ عقیدہ پختہ ہوتا گیا کہ ان میں بعض کتابیں اصح الکتاب بعد کتاب اللہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان میں وحی غیر متلو کو محفوظ کرلیا گیا ہے، جس کے بغیر قرآن کی تفہیم ممکن نہیں۔گویا یہاں بھی زبانی اور تحریری تورات کے تصورات نے اپنی جگہ بنالی اور عملی طور پر ہوا یہی کہ تحریری وحی زبانی وحی کے تابع ہو کر رہ گئی۔

علمائے یہود نے وحی کے گرد باطنیت کے نام سے ایک اور حصار بنا ڈالا۔تصوف کے زیر اثر وحی الٰہی کے باطنی اور حقیقی معنی کی بحث چھڑ گئی۔یہودی صوفیاء اس نتیجے پر پہنچے کہ تورات کی روح دراصل اس کے باطنی معنوں میں مضمر ہے۔انسان راست خود مشاہدۂ حق کی منزل پر پہونچ سکتا ہے، شرط یہ ہے کہ وہ تورات کے ان باطنی معانی سے آگاہ ہوجائے۔تورات جو بنی اسرائیل کے لئے کتابِ ہدایت تھی اپنے باطنی معنی کی وجہ سے صرف خواص کے لئے مخصوص ہوگئی۔''مشناۃ'' میں باضابطہ اس بات کی صراحت کردی گئی کہ کتاب پیدائش کے باطنی معنی کی تعلیم ایک وقت میں ایک سے زیادہ آدمیوں کو نہ دی جائے، اس کی سخت ممانعت ہے یہ بھی کہا گیا کہ کتاب ''حزقیل'' کے پہلے باب کی تعلیم تو ایک آدمی کو بھی نہیں دینی چاہئے الّا یہ کہ اس نے مقام ولایت حاصل کرلیا ہو[۴] ''زہار'' جسے یہودی تصوف کی معتبر ترین کتاب سمجھا جاتا ہے، ذاتی مکاشفات کے سہارے تورات کی تشریح وتعبیر کے لئے معروف ہے۔

ہم یہ تونہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں میں بھی قرآن کے باطنی معانی کا تصورا تنا ہی مقبول خیال ہے

جتنا کہ یہودیت میں۔ البتہ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ قرآن کے باطنی معانی کا تصور ہمارے علمی ورثے میں بالکل اجنبی خیال نہیں ہے کہ تصوف کے شیخ الشیوخ علامہ ابن عربی اپنے تمام تر انحراف اور گمرہی کے باوجود ہمارے تہذیبی اور علمی ورثے میں آج بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ''فصوص الحکم'' اور ''فتوحات مکّیہ'' سلوک واحسان کی بنیادی کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ ان ہی ابن عربی کا کہنا ہے کہ قرآن میں حروف واعداد کے اندر پراسرار معانی پوشیدہ ہیں، جن تک رسائی صرف اہل باطن کو ہوسکتی ہے۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اہل باطن دین کے علم کو خدا اور رسولؐ سے براہ راست لیتے ہیں۔ بقول ان کے ''جس معدن سے نبی لیتے تھے اسی مقام سے انسان کامل، ولی یا اصحاب باطن بھی لیتے ہیں''۔[۵] چونکہ مسلمانوں نے اصولی طور پر یہ عقیدہ تسلیم کرلیا ہے کہ رسولؐ اللہ کو وحی کے علاوہ وحی خفی یا الہام بھی ہوتا تھا اور چونکہ الہام ایک ایسی کیفیت ہے جس کے دعویدار صوفیاء بھی ہیں اس لئے قرآن مجید میں باطنی مفہوم متعین کرنے کے لئے الہام کی یہ سند کارگر ثابت ہوئی۔ اسی نظریے نے شریعت اور طریقت کے تصورات کو جنم دیا۔ اس قسم کی حدیثیں سامنے لائی گئیں کہ بقول ابو ہریرہؓ: ''رسول ﷺ نے مجھے دو برتن عطا فرمائے، ایک کو میں نے کھول کر عام کردیا ہے اگر دوسرے کو بھی کھول دوں تو ڈر ہے کہ میری شہ رگ نہ کاٹ دی جائے۔''[۶] یہ علم جسے ابو ہریرہؓ نے عام لوگوں پر منکشف نہیں کیا وہی طریقت اور باطنی علم ہے۔ جس تک رسائی ہر خاص وعام کے لئے ممکن نہیں۔

قرآن ہو یا تورات باطنی معانی کی تلاش کا کام دراصل اس کی تنسیخ وتحریف کا عمل ہے ۔ یہ در اصل اپنی خواہشات کو آیات الٰہی پر مسلط کردینے کے مترادف ہے۔ ہمارے خیال میں قرآن کی اس طرز کی صوفی تعبیریں بڑی حد تک یہودی تصوف کی دین ہیں۔ اور اس طرز تعبیر پر ''زہاری تصوف'' کی چھاپ نمایاں ہے۔ ان ہی پوشیدہ معانی کی تلاش میں اہل یہود کی طرح ہمارے علماء بھی حروف اور اعداد کے علوم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اہل یہود کی طرح ہمارے یہاں بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ وحی کے اصل معانی یا اس کی سریت الفاظ کو ایک خاص طریقے سے ترتیب دینے اور اس کے اعداد متعین کرنے میں ہے۔ قرآنی نقوش میں علمِ اعداد کی سریت بڑی حد تک یہودی ماخذ سے مستعار ہے۔[۷] مسلمانوں میں باطنی علوم کے علمبرداروں کو خواہ کتنی ہی محدود کامیابی کیوں نہ ملی ہو، واقعہ یہ ہے کہ اصحاب کشف اور اہل سلوک کو مروّجہ مسلم فکر سے یکسر الگ نہیں کیا جاسکتا۔

وحی کی تفہیم میں یہودی مآخذ سے استفادہ اور یہودی طریقۂ تفہیم کی مداخلت نے مزید پیچیدگیوں کو جنم دیا۔ مسلمانوں کا رویہ بھی کتاب الٰہی کی طرف کچھ اسی انداز کا ہو گیا جس کی روایت اہل یہود کے یہاں موجود تھی۔ مثال کے طور پر یہودیوں کی طرح ہمارے یہاں بھی یہ عقیدہ در آیا کہ تورات کی طرح قرآن مجید کا اصل نسخہ آسمانوں میں محفوظ ہے۔ سورہ بروج میں قرآن مجید کا لوح محفوظ میں ہونے کا جو تذکرہ آیا ہے اس سے یہ سمجھ لیا گیا کہ یہ لوح محفوظ آسمانوں میں کہیں واقع ہے۔ حالانکہ کسی ایسی تاویل کی نہ تو اس آیت میں گنجائش تھی اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ نے اس طرح کی کوئی بات ارشاد فرمائی تھی۔ لوحِ محفوظ کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا کہ یہ کتاب ایک ایسے عہد میں نازل ہو رہی تھی جب تحریر نویسی ایک معروف فن کی حیثیت سے جانی جاتی تھی اور وقت کا رسولؐ اسے خود تحریری شکل میں مرتب کر رہا تھا۔ صحابہ کرامؓ کو یہ بات بتائی جا رہی تھی کہ قرآنِ مجید کو دیکھ کر پڑھنا اور تحریری دستاویز سے اس کی تعلیم و تعلّم کا کام زبانی کے مقابلے میں زیادہ مناسب ہے۔ وحی کے نسخے تحریری شکلوں میں لوگوں کے درمیان گردش میں تھے۔ اس کے علاوہ آپؐ کا اس بارے میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اسے خود یاد کرنے اور صحابہ کرام کو یاد کرانے کے باوجود اس کے تحریری حفظ اور املاء کا خاص اہتمام فرما رہے تھے۔ یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ آپؐ کے وصال سے پہلے قرآن مجید دفتین میں مرتب ہو چکا تھا۔ وحی کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب اس کے تعلیم و تعلّم، حفظ و قرأت اور تحریر و املاء کے ذریعے اس کی حفاظت کا انسانی سطح پر اتنا منظّم اور محتاط انتظام کر دیا گیا ہو۔ یہی وہ لوح محفوظ تھا جس کو مداخلت شیطانی اور ترمیم و تنسیخ کے عمل سے محفوظ کر دینے کا خود اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا اور جس کی تصدیق پر آج بھی چودہ صدیوں کی انسانی تاریخ گواہ ہے۔ اس سیدھی سادی بات اور امر واقعہ کو یہودی معلومات کی مداخلت نے ایک معمہ بنا ڈالا۔ کسی نے کہا لوحِ محفوظ آسمانوں میں ہے جہاں تک شیطان کی رسائی نہیں۔ تو کسی نے اسے اسرافیل کی پیشانی پر ثبت بتایا۔ کسی نے کہا کہ اس سے مراد اُمّ الکتاب ہے جس میں قرآن اور تمام کتب سماوی محفوظ ہیں۔ بعض کمزور روایتوں کو احادیث کا درجہ دے کر یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ لوحِ محفوظ دراصل ایک ایسا خزینۂ علم ہے جس میں مستقبل کا سارا علم بند ہے، خود اللہ سبحانہ تعالیٰ اس میں ہر دن ۳۶۰ مرتبہ دیکھتا ہے۔ اسی میں لکھا ہے کہ آج کون گرا ہوا اٹھے گا اور کون اٹھا ہوا گرے گا، کون فقیر امیر ہو جائے گا اور کون امیر فقیر، کسے

مرنا ہے اور کسے جینا ہے۔ کسی نے کہا کہ لوحِ محفوظ میں سب سے پہلی چیز جو اللہ تعالیٰ نے لکھی وہ یہ بات تھی کہ میں اللہ ہوں میرے علاوہ کوئی اللہ نہیں۔ محمدؐ میرے رسول ہیں، جس نے ہماری قضا کے آگے سر جھکا دیا اور میری طرف سے بھیجی گئی بلاؤں پر صبر کیا، میری نعمت کا شکر گزار ہوا تو اسے ہم نے صدیقین میں لکھ لیا اور جس نے ایسا نہ کیا تو وہ ایسا ہی ہے جیسے اس نے میرے علاوہ کسی اور کو الٰہ بنالیا۔ کسی نے کہا کہ اس لوح کی لمبائی آسمان و زمین کی مسافت کے برابر ہے اور اس کی چوڑائی مشرق و مغرب پر محیط ہے۔ کسی نے یہ روایت کی کہ لوحِ محفوظ درّہ بیضاء سے بنایا گیا ہے اور اس کے صفحات لال یاقوت سے بنائے گئے ہیں اور اس کی کتابت و طباعت میں نور ہی نور استعمال ہوا ہے۔ گویا جتنے منہ اتنی باتیں۔ یہ تمام روایتیں ضعیف الاصل اور انسانی ذہن کی اختراع ہیں۔ صاحب جلالین کا خیال ہے کہ ان تمام مباحث کی کوئی سند نہیں لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ طبری، قرطبی اور ابن کثیر جیسی معتبر اور ثقہ تفسیروں میں اس قسم کی تشریحات کی بھرمار ہے۔ دفتین والی کتاب کے تذکرے کو جسے دراصل امت مسلمہ کے Mission Statement کی حیثیت حاصل ہے، آپ نے دیکھا کس طرح زمین سے اٹھا کر آسمانوں میں محفوظ کر دیا گیا اور امت مسلمہ بھی اہل یہود کی طرح اپنے صحیفہ کے سلسلے میں ان ہی اوہام کا شکار ہوگئی کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ تو بس ایک پرتو ہے، اس قرآن مجید کا جس کا اصل عرش کے دائیں طرف لوحِ محفوظ میں ہے[8]۔

لوحِ محفوظ کی یہ تشریح تو ہم نے محض از راہ مثال پیش کی۔ دراصل ہم جو بات بتانا چاہ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اہل یہود کے علمی ماخذ کے زیر اثر ہمارے یہاں یہ رویہ پیدا ہوا ہے کہ وہ تمام کام جو امت مامور کی حیثیت سے ہمیں بہ نفس نفیس اسی دنیا میں انجام دینا ہے اور جس کے لئے ہم مذہبی طور پر سزاوار ہیں۔ ان تمام کاموں کو بھی ہم نے دوسری دنیا کے لئے مؤخر کر دیا ہے یا کم از کم یہ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ کسی مردے از غیب کے ظہور سے خود بخود تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ یہودی اور عیسائی خیالات کے زیر اثر مسلمانوں میں مہدیٔ آخر الزماں، مسیح موعود یا مجدد کا عقیدہ کچھ اس طرح در آیا ہے کہ عامتہ الناس تو کجا بڑے بڑے اصحابِ فضیلت بھی اس بات کے احساس سے قاصر ہیں کہ ایک ایسی امت کے لئے جو ختم نبوت پر یقین رکھتی ہو، یہ عقائد سم قاتل ہیں[9]۔ لیکن ہم جو بے عملی کے شکار اچھے وقتوں کے انتظار میں مردے از غیب کی راہ تک رہے ہیں صرف خواہشات اور وظائف

کے زور سے نبی آخر کو مقامِ محمود پر فائز دیکھنا چاہتے ہیں۔ اپنی سہولت کے لئے ہم نے مقامِ محمود کو بھی آخرت میں منتقل کر دیا ہے، جہاں اس منصب مخصوص سے عقیدہ شفاعت وابستہ ہے، حالانکہ مقامِ محمود کے لئے کی جانے والی دعا کا اس کے علاوہ اور کچھ مقصود نہیں کہ محمدؐ کا مشن پورا ہو، دین غالب ہو اور پوری دنیا پر محمدی نظام عدل کا پرچم لہرانے لگے۔ اس کے برعکس یہ سمجھنا کہ یہ کوئی منصب مخصوص ہے جس پر آخرت میں رسولؐ کو فائز کیا جانا ہے اور جس کے لئے اللہ کا وعدہ بھی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس وعدے کو پورا نہ کرے۔ پھر اس بارے میں کسی تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس دعا میں ہمارا کوئی رول تو اسی وقت ہوسکتا ہے جب اسے ہماری کوششوں سے اس سرزمین پر انجام پانا ہو۔

آخری امت کی حیثیت سے قرآنی وحی ہمارے لئے قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن افسوس کہ ہمارے غلو نے ہمارے اور وحی کے درمیان تقدس کا ایک ایسا حجاب حائل کر دیا جس نے اس کتاب ہدایت کو کتاب امانی میں تبدیل کر دیا۔ ایک بات تو یہ کہی گئی کہ قرآن کا ہر لفظ باعث برکت ہے، اس کا پڑھنا، سننا، دیکھنا خواہ اس کے معانی ومفاہیم سے واقفیت ہو یا نہ ہو اپنی جگہ باعث خیر و برکت ہے۔ بعض آیتوں اور سورتوں کے سلسلے میں مخصوص خاصیتیں بتائی گئیں اور ان کے بار ہا پڑھے جانے کو بلاؤں سے نجات اور آخرت میں کامیابی کا ضامن قرار دیا گیا۔ یہ کم وبیش وہی عمل تھا جو اہل یہود اپنی مقدس کتاب کے سلسلے میں انجام دے چکے تھے۔ ان کے ربائیوں نے یہ کہہ رکھا تھا کہ جس شخص کے کان میں تورات کے الفاظ ایک بار بھی پڑ گئے ہوں اس پر دوزخ کی آگ حرام ہے، حتیٰ کہ کسی یہودی نے اگر یہودی ربائیوں اور بزرگوں کا نام بھی احترام ومحبت سے لیا ہو تو یہ بات خود جنتی ہونے کے لئے کافی ہے۔ پھر یہ عقیدہ بھی وضع کیا گیا کہ قیامت کے دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شفاعت کسی مختون اسرائیلی کو جہنم میں جانے نہ دے گی[۱۱] اس طرح کی باتوں سے وحی سے اکتساب فیض کا عمل برکتوں کے حصول تک محدود ہو گیا۔ ساری توجہ متن کی ظاہری شکل وصورت، اس کی قرأت و کتابت پر مرکوز رہی۔ یہودیوں کی طرح مسلمانوں میں بھی وحی کی آیات کو خوبصورت طغرے اور مرصع کتابت میں لکھنے کا رواج پیدا ہوا۔ ایک طرف تو وحی کو حصول برکت کا ذریعہ بنا کر اس کے اصل مطالب سے دوری اختیار کی گئی اور دوسری طرف یہ بتانے کی کوشش کی گئی کہ وحی سے

اکتساب ہر خاص و عام کے بس کا کام نہیں۔ یہودیوں نے تورات کو تلمودی علوم کا تابع کر رکھا تھا، ان کے یہاں یہ بات مسلّم تھی کہ یہودی علماء و مفسرین سے الگ ہٹ کر نہ تو تورات کی کوئی تفہیم مستند ہوسکتی ہے اور نہ ہی یہ کسی شخص کے بس کی بات ہے کہ وہ براہ راست تلمودی سلسلۂ علم سے مستغنی ہوکر، تورات سے اکتساب کر سکے۔ کچھ اسی قسم کی صورت حال قرآنی وحی کے سلسلے میں مسلمانوں کے یہاں پیدا ہوگئی۔ ائمہ اربعہ کی تقلید کو عقیدے کا سا اعتبار حاصل ہوگیا۔ رہا قرآن سے براہِ راست اکتساب کا معاملہ تو اس بارے میں ایک عمومی رویہ یہ پیدا ہوا کہ راست اکتساب کا کام صرف مجتہد ہی کرسکتا ہے اور مجتہد وہ ہے جو بقول علامہ بغوی ''پانچ قسم کے علوم کا جامع ہو: کتاب اللہ کا علم، سنت رسول کا علم، علمائے سلف کے اقوال، علم اللغۃ پر عبور اور قیاس کا علم۔ اس کے علاوہ اسے ناسخ و منسوخ، مجمل و مفصل، خاص و عام، محکم و متشابہ، کراہۃً اور تحریم، مستحب اور وجوب سے پوری واقفیت بھی ہو۔ فن حدیث میں ضعیف، مسند اور مرسل کے بارے میں باخبر ہو، قرآن و حدیث کے بظاہر اختلاف میں تطبیق کا فن جانتا ہو، احکام کے سلسلے میں صحابہ و تابعین کے اقوال اور جمہور فقہائے امت کے فتاویٰ سے آگاہ ہو۔ اگر کسی کے اندر کم از کم اتنی خصوصیات جمع ہوجائیں جب ہی اسے اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ وحی سے راست اکتساب کے لئے رجوع کرے۔'' ظاہر ہے کہ اتنی بہت سی خصوصیات اور اتنے بہت سے علوم کا جامع ہونا ایسی شرط ہے جو عام پڑھے لکھے مسلمان کو کتاب ہدایت سے براہِ راست اکتساب کے لئے عالائق (un-qualified) قرار دیتی ہے[۱۱]۔ ایسے لوگوں کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں رہ جاتی کہ وہ کتاب ہدایت کو اپنے غور و فکر کا محور بنانے کے بجائے اسے کتاب فضائل یا کتاب الأمانی کی طرح برتنے پر اکتفا کریں اور بس۔

اہل یہود کے یہاں اب یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ دین کی تشریحات تلمودی ادب میں موجود ہیں۔ انھوں نے تورات کے معانی کو وسعت دے کر تشریحی، تعبیری اور فقہی ادب کو زبانی تورات میں شامل کرلیا ہے۔ اب ان کے یہاں خمسہ موسوی کی حیثیت تقدس اور تبرک کے حوالے سے ہے، ورنہ اصل کتاب ہدایت تو تلمود ہے۔ ہمارے یہاں بھی بدقسمتی سے قرآن کو کتاب ہدایت کے بجائے کتاب امانی میں تبدیل کردیا گیا ہے۔ مسلمانوں میں آیات قرآنی کے انتخابات کے ایسے مجموعے خاصے مقبول ہیں جن میں مختلف سورتوں کی ترتیل پر کثرت ثواب کی بشارت سنائی گئی ہے۔

ان ہی مجموعوں میں ایسی روایتوں کی بھی کثرت ہے جس میں معمولی معمولی نیکی پر جنت میں ہزاروں ہزار محلوں کی بشارت موجود ہے۔ محدثین نے فضائل کے سلسلے میں احادیث قبول کرنے میں بڑی سہل پسندی سے کام لیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ قرآنی وحی کے مقابلے میں خودساختہ اوراد و وظائف کے ذریعہ جنت تک پہنچنا آسان ہو گیا ہے۔ بعض روایتوں نے قرآن کو کتاب ہدایت کے بجائے کتاب حفاظت میں تبدیل کر دیا ہے۔ بخاری کی ایک روایت ہے کہ جو شخص سوتے وقت آیت الکرسی پڑھے تو اس پر خدا کی جانب سے ایک محافظ مقرر کر دیا جاتا ہے اور اس طرح اس کا مال چوری سے محفوظ رہتا ہے۔[۱۲] حد تو یہ ہے کہ بعض وضعی حدیثوں کے مطابق "**من ولد له مولود فسماه محمدا كان هو والوالد في الجنة**" کسی نے کہا کہ "**من قال لا اله إلا الله اعطى في الجنة سبعين الف مدينة، في كل مدينة سبعون الف قصر، في كل قصر سبعون الف حورا**" کسی نے کہا کہ جو شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھے گا وہ دجال کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔[۱۳] یہ اور اس قسم کی روایات نے وحی کے گرد فضائل کا ایک ایسا حصار کھینچ دیا جس کا عبور کرنا عام انسان کے لئے مشکل ہو گیا۔ بعض حضرات نے قرآنی سورتوں کے خواص دریافت کیے اور ان کی بنیاد پر نقوش قرآنی کا سفلی طریقہ رائج کر دیا۔ کسی نے کہا کہ اگر ویران باغ میں سورۂ مریم کا نقش باندھ دیا جائے تو اس کی بہار لوٹ آئے گی۔[۱۴]

اس طرح کے غیر اسلامی بلکہ کافرانہ عملیات اور سفلی طریقوں نے وحی قرآنی کو اعمال قرآنی میں محدود کر دیا اور اس طرح امتِ مامور کے ہاتھوں سے لوحِ محفوظ والی کتابِ ہدایت دیکھتے دیکھتے نکل گئی۔ دفتین کی یہ کتاب تو اس کے پاس اب بھی محفوظ ہے، لیکن عوام کے لئے اس کا استعمال فضائل قرآنی اور اعمال قرآنی کی حیثیت سے ہے، کتاب ہدایت کی حیثیت سے نہیں، کہ کتاب ہدایت کی اجارہ داری یا اس کی تشریح و تعبیر کا حق جن لوگوں کے لئے مخصوص سمجھا گیا ہے، وہ اب اس دنیا میں نہیں پائے جاتے۔ فہم قرآنی اور تعبیر و تشریح کا تمام کام، یہ سمجھا جاتا ہے کہ متقدمین کے ہاتھوں انجام پا چکا ہے: **ان الاوائل لم يتركوا لاواخر شيئاً**۔ جمہور مسلمانوں کا کام ائمہ اربعہ کی تقلید اور غیر مقلدین کے یہاں صحاح ستہ کے مصنّفین پر غیر معمولی اعتماد۔ یہی سب کچھ وہ مذہبی سرمایہ ہے جو متقدمین کے حوالے سے ہمیں حاصل ہے، وحی تک براہِ راست رسائی اس طریقۂ تعلیم

نے عملاً ناممکن بنادیا ہے۔[۱۵]

اہل یہود کی شریعت تلمود جسے تخصیص کے ساتھ حلاقہ کہنا چاہئیے ، کی طرح ہمارے یہاں بھی یہ خیال عام ہے کہ مجتہد نے قرآنی وحی سے تمام ممکنہ مسائل کا استنباط اور استخراج کرلیا ہے، اس لئے عام لوگوں کے لیے فقہ کی مدون کتابوں میں رہنمائی کے لئے کافی سامان دستیاب ہے۔ اس عمل نے کتاب کو اگر منسوخ نہیں کیا تو کم از کم اس سے بڑی حد تک لوگوں کو بے نیاز کردیا۔ مجتہد کے لیے سخت شرائط اور کتاب سے راست رجوع کے لیے جس طرح جامع العلوم ہونا شرط قرار دیا گیا۔ اس نے بڑی حد تک وہی صورت حال پیدا کردی جس کی کوشش علمائے یہود وحی موسوی کے سلسلے میں عملاً کرچکے تھے۔ ان کے کہنا تھا کہ ''تلمود کے بغیر ہم بائبل کے اقتباسات نہیں سمجھ سکتے'' انھوں نے یہ عقیدہ گھڑ لیا تھا کہ ''بائبل کی تشریح کا حق خدا نے متقدمین یا بزرگوں کو دے رکھا ہے اور یہ کہ روایات کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ خود مصحف وحی کی''۔[۱۶] دوسری طرف متقدمین نے بھی اپنے طور پر یہ اصول وضع کرلیا کہ جو شخص تلمود کے مطالعے سے اعراض کرے اسے مصحف کا فہم حاصل نہیں ہوسکتا۔ Pirke Avot، جسے مشناۃ میں تقریباً دوسو پچاس عیسوی میں داخل کیا گیا، میں باضابطہ اس بات کی صراحت موجود ہے کہ تورات کے گرد اس کی حفاظت کی خاطر ایک حصار بنایا جائے۔ اسباقِ بزرگاں (Chapters of the Fathers) اس طرح شروع ہوتا ہے: ''موسیٰ کو سینائی پر تورات دی گئی جس نے اسے حضرت یوشع کو، یوشع نے بزرگوں کو، بزرگوں نے انبیاء (کاہنوں) کو اور پھر کاہنوں نے اسے عظیم اسمبلی کے سپوتوں کے حوالے کردیا۔ انھوں نے تین باتوں کی تاکید کی، فیصلے میں انصاف کرو، شاگردوں کی نسل تیار کرو اور تورات کے گرد ایک حصار بناڈالو''۔[۱۷]

تلمودی ادب دراصل تورات کے گرد بنایا جانے والا یہی وہ مضبوط حصار ہے جس کے بغیر اب تورات کی کسی بھی تفہیم کو اعتبار حاصل نہیں۔ دیکھا جائے تو یہ تقریباً وہی عمل ہے جو ہمارے یہاں فقہائے عظام اور مجتہدین کے ہاتھوں قرآنی وحی کے ساتھ ہوا ہے، جس طرح تلمودی ادب کے بغیر تورات کا کوئی فہم مستند نہیں ہوسکتا، اسی طرح متقدمین اور سلف کے طریقۂ تعبیر سے الگ فہم قرآنی کے کسی اور طریقے کو اعتبار حاصل نہیں۔ گزشتہ مباحث میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ وحی سے براہ راست اکتساب فیض کے لئے علمائے متقدمین نے کتنی سخت شرائط عائد کی ہیں اور اسے صرف مجتہد کا حق قرار

دیا ہے، جس کے لئے کتاب وسنت کے علم کے علاوہ ناسخ ومنسوخ کا علم اور اجماع سابقہ سے واقفیت بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔ رہی یہ بات کہ منسوخ آیتوں کا علم کس طرح حاصل کیا جائے تو اس بارے میں غزالی نے ان قدیم کتب کی طرف اشارہ کیا ہے جن میں ان مسائل پر تفصیلی بحث موجود ہے۔ اسی طرح مجتہد کے لیے یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اجتہاد سے پہلے یہ ضرور دیکھے کہ اس کا یہ عمل اجماع سابقہ کے خلاف تو نہیں۔ ائمہ اربعہ میں سے کسی کے یہاں سے اس کے خیال کی حمایت ہوتی ہے یا نہیں[۱۸]۔ دیکھا جائے تو مجتہد کو وحی سے اکتساب کی جو آزادی ایک ہاتھ سے دی گئی ہے اسے دوسرے ہاتھ سے یہ کہہ کر چھین لیا گیا ہے کہ اجماع سابقہ کے خلاف اس کا اجتہاد قابل قبول نہیں ہو سکتا، اسی طرح ناسخ ومنسوخ کی بحث کے لئے قدیم مجتہدین کی کتابوں کو ماخذ اور فیصلہ کن اہمیت دے کر عملاً قرآنی وحی کی ہر تعبیر وتفہیم کو قدماء کے فہم کا تابع بنا دیا گیا ہے۔ گویا روایات اور تاریخ کے ذریعے قرآنی وحی کو قید کرنے کی کوشش میں جو کسر رہ گئی تھی اس رہی سہی کسر کو فقہ نے پورا کر دیا۔

تورات، جس کے لفظی معنی قانون کے ہیں، اہل یہود کے لیے کتاب احکام کی حیثیت رکھتی تھی۔ علمائے یہود نے ان صریح احکام سے اعراض برتنے کے لیے اولاً تو یہ عقیدہ گھڑا کہ اس کے بالمقابل زبانی تورات کی بھی اسی قدر اہمیت ہے جو سینہ بہ سینہ بزرگوں کے ذریعہ ان تک پہنچی ہے۔ ثانیاً اس کتاب احکام سے احکام کی تخریج وتعبیر کا ایک مکمل فن وجود میں آ گیا، جس میں وحی سے کہیں زیادہ علمائے یہود کی اپنی تعبیرات کو دخل تھا۔ اس ربائی لٹریچر کو تقدس عطا کرنے کے لیے اسے تفقہ اور تدبر سے تعبیر کیا گیا اور تحریری تورات کے مقابلے میں اس کی اہمیت مسلم کرنے کے لیے یہاں تک کہہ دیا گیا کہ مذہب یہود کی تمام تر تعلیمات اور اس کی تشریحات کے مآخذ دراصل طور پر جلوہ گر ہونے والی ''روشنی'' اور ''صدا'' میں واقع ہے[۱۹] اور یہ کہ مستقبل میں پوچھا جانے والا اب کوئی ایسا سوال نہیں ہے جس کے بارے میں موسیٰ کو سینائی پر بتایا نہ گیا ہو۔ اور چونکہ روشنی اور صدا کے حوالے سے وحی کی تعبیر میں خاصی گنجائش پیدا ہو گئی تھی، اس پر طرہ یہ کہ زہاری تصوف کے حوالے سے ہر وحی کی ستر تعبیریں ممکن ہو گئیں[۲۰]۔ تورات کے گرد ربائی طریقۂ تفہیم کے حصار نے اب عام لوگوں کے لیے ایک ہی راستہ کھلا رکھا، وہ یہ کہ تلمود میں وحی کی جو تشریح موجود ہے اس پر اکتفا کر لیا جائے اور

بس۔اور چونکہ ان تشریحات کا ایک قابل ذکر حصہ مسائل واحکام سے متعلق تھا اس لئے عملی طور پر اہل یہود اپنی تاریخ میں تورات سے بڑی حد تک بے نیاز ہوگئے۔تلمود ان کی زندگی کا مرکز ومحور بن گیا۔ آج بھی مخصوص مذہبی دنوں میں یا سیناگاؤگ کی اسمبلی میں خمسہ موسوی کی حیثیت صرف کتاب تلاوت کی ہے جسے ازراہِ برکت پڑھا جاتا ہے، ورنہ رہنمائی کے لئے تلمود کا وسیع فقہی لٹریچر کافی سمجھا جاتا ہے۔

ہم مسلمان اصولی طور پر تو اپنے آپ کو قرآنی وحی سے بے نیاز نہیں سمجھتے، کہ اب بھی جمہور مسلمانوں میں قرآن بحیثیت کتاب ہدایت ایک مسلمہ خیال ہے، البتہ عملی زندگی میں ائمہ اربعہ کے فقہی حصار نے راست رجوع کا دروازہ بند کر رکھا ہے۔اس کیفیت کو ہمارے یہاں ''اجتہاد کا دروازہ بند'' ہے جیسے بیان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔گو کہ علماء میں شروع سے ہی اجتہاد کے حامیوں کا ایک قابل ذکر گروہ رہا ہے لیکن عملی طور پر اجتہاد کے یہ علمبردار بھی صرف فروع میں اجتہاد کو روا سمجھتے ہیں۔یہ خیال کہ ائمہ اربعہ کے تفقہ وتدبر سے بلند ہو کر اب بھی وحی کی جلوہ سامانی ہماری گم کردہ راہ کو منور کر سکتی ہے، ایک ایسا خیال ہے جس کی کم از کم راسخ العقیدہ مسلم فکر میں گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔وحی کی تفہیم اور اس کا اظہار جتنا کچھ ائمہ اربعہ کے یہاں ہوا ہے، اگر صرف اسی کو انسانی اکتساب وحی کا کمال سمجھا جائے اور اس سے آگے راست اکتساب کی کوئی شکل ممکن نہ ہو تو یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ اس فقہی لٹریچر نے امت کو قرآنی وحی سے بے نیاز کر دیا ہے۔جذباتی طور پر اس صورت حال کو قبول کرنا شاید ممکن نہ ہو لیکن یہ ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے جس پر صدیوں کا فقہی ذخیرہ گواہ ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ اہل یہود کی طرح فقہ کے ارتقاء میں اور وحی کے گرد انسانی حصار بنانے کے عمل میں اس قدر مماثلت کیوں کر ہے۔اس کی ایک وجہ تو شاید یہ ہو سکتی ہے کہ ایک امت پر دوسری امت کے تہذیبی اثرات پڑتے رہے ہیں لیکن دوسری اور اس سے بھی اہم وجہ یہ ہے کہ انسانی ذہن اپنی تمام تر تابنا کی کے باوجود لامتناہی وحی کو اپنی ذہنی سطح پر codified یعنی مدوّن انداز سے دیکھنا چاہتا ہے۔وحی بنیادی طور پر ایک ایسی روشنی ہے جو ہماری راہ کے علاوہ قلب ونظر کو روشن کرتی ہے۔ قلب مومن کے لئے وحی کے مطالب کا سمجھنا اور اس راہ پر چل نکلنا ایک فطری اور آسان عمل ہوتا ہے۔البتہ اگر وحی کو کتاب احکام کی حیثیت دینے کی کوشش کی جائے تو پھر رفتہ رفتہ انسانی فہم کا حصار

اسے صرف ڈوز اور ڈونٹ (Do's & Don'ts) کی فہرست میں تبدیل کر دیتا ہے۔ عہد رسول ﷺ میں لوگوں کی نگاہیں مطالب وحی پر تھیں اس کے form پر نہیں۔ اسامہ بن شریک جوحج میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، ان سے روایت ہے کہ لوگ آپؐ کے پاس آتے۔ کوئی کہتا: یارسول اللہ میں نے طواف سے پہلے سعی کرلیا، کوئی کہتا: میں نے فلاں چیز پہلے کرلی، میں نے فلاں چیز بعد میں کی۔ آپ ﷺ کا جواب ہوتا: ''اس میں کوئی حرج نہیں۔ حرج کی بات اور ہلاک کرنے والی بات تو یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی عزت پر حملہ کرے۔''[۱۲] لیکن جب وحی کو کتاب الاحکام کی حیثیت سے برتنے کا رواج چل نکلا اور ان آیات کی نشان دہی ہونے لگی جس سے احکام برآمد ہوتے ہوں، اور جب احکام القرآن پر کتابیں ترتیب پانے لگیں تو وحی کو thou shalt not do کا مرادف سمجھ لیا گیا، جس کے استنباط اور استخراج کے لیے فقہاء کی مجلسیں آباد ہوگئیں۔ قرآن میں اہل یہود کے اس رویے کی تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ غیر ضروری سوالات سے اصل مسئلے سے توجہ ہٹاتے اور خود اپنے لیے مشکلیں پیدا کرتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئیے تھا کہ وحی کی طرف اس عہد کے علماء اپنے عہد کو منور کرنے کے لئے رجوع کرتے لیکن اس کے برعکس ہوا یہ کہ وہ تمام سوالات قائم کیے گئے اور عجیب و غریب، نامعلوم اور غیر موجود فرضی صورت حال کے لیے بھی مسائل کے استنباط کو فقہاء نے اپنے دائرۂ کار میں شامل کرلیا۔ کوشش کی گئی کہ کوئی ایسا مسئلہ اس آسمان کے نیچے ایسا نہ رہے جس کا مدوّن جواب ان فقہاء کی مجلسوں میں تیار نہ کرلیا گیا ہو۔ وحی کو اخلاقیات اور احکام کی سطح پر اتارنے سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں اور وہ وہ فقہی اختلافات رونما ہوئے جن سے اب تک اس امت کو نجات نہیں مل سکی ہے اور شاید اس وقت تک نہ مل سکے جب تک ان مدون فقہ کے سلسلے میں تنقیدی نقطۂ نگاہ پیدا نہ ہو، اور جب تک قرآنی وحی سے راست اکتساب ہمارے لیے ممکن ہو سکے۔

ہم یہ عرض کررہے تھے کہ وحی کے سلسلے میں اہل یہود کی طرح ہمارے یہاں بھی حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہ بات بھی محل نظر رہے کہ یہودی ربائی اور مسلم علماء دونوں کا منصب مذہبی اعتبار سے غیر متعین ہے۔ عیسائی پادریوں کے برخلاف اسلام اور یہودیت میں علماء کا کوئی باضابطہ ادارہ تسلیم شدہ نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ان دونوں مذاہب میں مذہبی فکر کی تعبیر اور اس کے تعین میں علماء نے اپنا رول محفوظ کرلیا ہے۔ عالم بنانے اور اس کو اعتبار بخشنے کا عمل بھی

دونوں روایتوں میں بڑی مماثلت رکھتا ہے۔ جس طرح یہودی ربائی اپنے شاگرد کو سمیخہ (Semikha) عطا کر کے اسے سند بخش سکتا ہے اسی طرح ہمارے یہاں بھی نئے تربیت یافتہ عالم کو پرانے استاد کے ہاتھوں درس وتدریس اور ارشاد وتعلیم کے لیے اجازۃ عطا کرنا اسے اعتبار بخش دیتا ہے۔ مشائخیت کو ایک ادارے کی حیثیت سے نہ تو یہودیت میں کوئی حیثیت حاصل تھی اور نہ ہی اسلام میں کسی کہانت یا پاپائیت کی گنجائش رکھی گئی تھیں، لیکن تلمود کو تقدس عطا کرنے والوں کے لیے یہ لازم تھا کہ وہ تلمودی مصنّفین کو بھی غیر معمولی تقدس اور تفقہ کا حامل بتائیں۔ لہٰذا تلمود میں اہل یہود کی مذہبی قیادت کو تقدس کا درجہ دینے کے لیے فقیہہِ وقت کو موسیٰ، ہارون اور سموئیل نبی کا ہم منصب بتایا گیا اور اہل یہود سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ جس طرح ان انبیاء کی اتباع تم پر لازم ہے اسی طرح موجودہ مذہبی قیادت بھی ان کی اتباع کی حقدار ہے[۲۲]۔ ہمارے یہاں بھی فقہی ادب کی وہ حیثیت نہ ہوتی اگر خود ان فقہاء کو خصوصی تقدس اور تفقہ کا حامل قرار نہ دیا جاتا۔ لہٰذا ہمارے یہاں بھی اس قسم کے تصورات عام ہوئے کہ شیخ اپنی قوم میں اسی طرح ہے جیسے کہ نبی اپنی امت میں: ''**الشیخ في قومه کالنبي في امته**''۔ ایک حدیث کے حوالے سے یہ بات کہی گئی کہ ہماری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی مانند ہیں۔ کسی نے کہا کہ جو شخص اللہ کے پاس بیٹھنا چاہتا ہے تو اسے اہل تصوف کے پاس بیٹھنا چاہئیے۔ اس طرح عملی طور پر یہودیت کی طرح اسلام میں بھی مقدس علماء کا ایک ادارہ وجود میں آ گیا جسے وحی کی تعبیر وتشریح میں مستند ماخذ کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

یہ بات وثوق کے ساتھ کہنا تو مشکل ہے کہ اسلامی اصول فقہ پر تلمودی ادب کے اثرات کس حد تک مرتب ہوئے ہیں البتہ تاریخی طور پر یہ بات مسلّم ہے کہ ابتدائی صدیوں میں نظام مملکت کے اصول جس طرح مرتب ہوئے ہیں اس میں مروّجہ رومی اور ایرانی طریقۂ تنظیم مملکت مثلاً خراج کی وصولی اور اس کے مروّجہ طریقوں سے نہ صرف یہ کہ اکتساب کیا گیا بلکہ اس کی ناانصافیوں کو دور کر کے اسے برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں دوسرے انتظامی ماڈل سے اکتساب کا صحت منداور تنقیدی رجحان پایا جاتا تھا۔ یہودی علماء جن کے یہاں تلمود کی تدوین کا کام مکمل ہو چکا تھا اور جو زبانی اور تحریری تورات کے تطابق کے فن میں ماہر تھے اور جن کے یہاں چھوٹے چھوٹے مسئلے پر بحث وتمحیص اور قیل وقال کی ایک روایت موجود تھی، ان کے قبول اسلام سے اس طریقۂ تطبیق

کا نئے مذہب میں آنے کا خیال عبث نہیں ہے۔ بعد کی صدیوں میں جب عباسی خلافت ممالک محروسہ یہودی اسکالرشپ کا گہوارہ بن گئے تھے، خود فقہ اسلامی کے اثرات اہل یہود کی مذہبی فکر پر صاف محسوس کیے جاتے تھے۔Moses Memonides جسے جدید یہودی فکر میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے، اس کے طریقۂ تطبیق پر مسلم فقہی methodology اور اس عہد کی مسلم فلسفیانہ موشگافی کی چھاپ بڑی نمایاں ہے، اس لیے ہم اس امکان کو قطعی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ابتدائے عہد میں مسلم فقہی methodology پر نومسلم یہودی علماء نے اپنے اثرات نہ ڈالے ہوں۔ فقہ کے لیے شریعت کا لفظ حلاقہ کے ہم معنی ہے جس کا معنی ہے راستہ۔ تدوین فقہ میں روایات جسے زبانی تورات یا وحی غیر متلو کی حیثیت رہی ہے اس کی جانب ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں۔ کتاب وسنت کے بعد اجماع کو کلیدی حیثیت دینا تلمودی ادب میں بنیادی قدر کی حیثیت سے ایک معروف طریقۂ کار ہے۔ اجماع یعنی رائے عامہ کو تلمود میں اس قدر حیثیت حاصل ہے کہ بعض اوقات اس سے نص میں بھی تبدیلی آ جاتی ہے[۲۳]۔ ہمارے یہاں بھی اجماع کو تقدس عطا کرنے کے لئے یہ بات کہی گئی کہ محمدؐ کی امت گمرہی پر جمع نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح استحسان یا مصالح امت تلمودی علماء کے نزدیک اصول فقہ میں ایک کلیدی قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ کچھ یہی حال عرف وعادات کا ہے جس کی تلمود میں اس قدر اہمیت ہے کہ (custom annuls law) رسم ورواج اور عرف وعادات نص کو تبدیل کر سکتے ہیں یا کم از کم وقتی طور پر احکام شرع کو معطل کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

ایک اہم اور حیرت انگیز مماثلت ان دو روایتوں میں فقہی لٹریچر کو تقدس فراہم کرنے کے سلسلے میں ہے۔ تلمود کی طرح ہمارے یہاں بھی ائمہ اربعہ کا تفقہ اور ان کی مدوّن فقہ تنقید واحتساب سے بالاتر ایک طرح کا تقدس لیے ہوئے ہے۔ بعد کے فقیہوں کے لیے صرف یہ کافی سمجھا گیا ہے کہ وہ متقدمین کی کتابوں پر تشریحی حاشیے لکھیں اور ان کے چراغوں سے اپنا چراغ روشن رکھیں۔ ابتدائی تین چار صدیوں میں وحی پر غور وفکر کا جو کام ہوا ہے اسے مستند اور حرف آخر سمجھ لیا گیا ہے۔ یہودی روایت میں کچھ یہی مقام Tannaim کو حاصل ہے جن کے سر تورات کی تشریح وتعبیر کے اصول وضع کرنے کا سہرا ہے اور جن کے بارے میں یہ خیال عام ہے کہ وہ اپنے علم اور تفقہ کی بنیاد پر تورات پر اجتہادی نگاہ ڈال سکتے تھے۔ غور وفکر کے بعد انھوں نے حلاقہ کی شکل میں جو سرمایہ چھوڑا ہے اسے یہودی

حلقوں میں غیر متبدل اور حرف آخر استخراج سمجھا جاتا ہے، اس کے بعد Amoraim کا سلسلہ ہے جسے Saboraim کی درمیانی کڑی کی حیثیت حاصل ہے۔ بعد کی دونسلیں گو کہ تقدس کے ہالے میں گھری نظر آتی ہیں لیکن ان کی تمام تر ذہنی کاوشیں Tannaim کی رہین منت ہیں۔ بعد کی دونسلوں کو Tannaim کی سی حیثیت تو حاصل نہیں البتہ انھیں بھی حلاقہ یعنی شرع موسوی کی تدوین میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ تین نسلوں پر محیط اس دور کو خاص تقدس عطا کرنا تقریباً وہی عمل ہے جو ہمارے یہاں ائمہ مجتہدین کے حوالے سے معروف ہے۔[۲۴] یا جس کی کسی حد تک گونج "**ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم**" کی مفروضہ حدیث میں سنائی دیتی ہے۔ ابتدائی دوصدیوں میں تدوین فقہ کے لیے رجوع الی کتاب وسنت کا تخلیقی رویہ اگلی صدیوں میں منجمد ہو جاتا ہے، بعد کے لوگوں کو تقلید کے علاوہ کوئی اور محفوظ راستہ نظر نہیں آتا۔ بعد کے فقہاء ان چار مکاتب فکر میں سے کسی ایک سے وابستہ کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ ان کا کام ان ہی ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کے مکتبہ فکر کو مزید ترقی واشاعت دینا قرار پاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تفقہ وتدبر کی سخت شرائط نے دونوں روایتوں میں وحی کے گرد جو حصار کھینچا تھا اسے توڑنا گزرتے وقتوں کے ساتھ ناممکن ہوتا گیا اور عملاً خمسہ موسوی کی طرح قرآنی وحی بھی محض کتاب احکام میں محدود (reduce) ہو کر رہ گئی۔

فقہ نہ صرف یہ کہ احکام کے استخراج کا کامل نمونہ قرار پا گئی بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ انسانی تشریح وتعبیر نے اصل وحی کے مطالب پر پردہ ڈال دیا ہو۔ مثال کے طور پر اہل یہود کی روایت کو لیجیے یہاں تورات میں صراحت کے ساتھ سبت کے دن کاموں کی ممانعت آئی تھی۔ سختی سے اس بات کی تاکید کی گئی تھی کہ یوم سبت کو کام کاج سے فارغ رکھا جائے، لیکن فقہائے یہود نے ان کاموں کی بھی ایک فہرست مرتب کر ڈالی جسے کام قرار دیا جا سکتا تھا۔ تلمود میں انتالیس (۳۹) کاموں کی ایک فہرست گنائی گئی ہے جس میں ہتھوڑے چلانے سے لے کر کسی چیز کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا بھی شامل ہے۔ بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کاموں کی یہ تخصیص اور فہرست سازی سبت کے احکام کو انسانی سطح پر تمام امکانات کے ساتھ برتنے کے لیے بنائی گئی ہے لیکن جب ایک ایک کام کی مزید تفصیل پر مباحث شروع ہوتے ہیں تو خود ان مباحث میں رخصت کی بڑی گنجائش نکل آتی ہے۔ مثال کے طور پر سامان کی منتقلی کے سلسلے میں مشناۃ میں جو تفصیلات وارد ہوئی

ہیں اسے چار طریقے سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کسی چیز کا ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا چار صورتوں کو جنم دے سکتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی فقیر گھر کے باہر کھڑا ہو اور صاحب خانہ گھر کے اندر ہو اور فقیر اپنا ہاتھ گھر کے اندر داخل کرے اور اس طرح صاحب خانہ کے ہاتھ میں کوئی چیز منتقل کر دے یا اس سے کوئی چیز وصول کرے اور پھر اپنا ہاتھ باہر نکال لے ایسی صورت میں فقیر کو سبت کے محرمات کا مرتکب سمجھا جائے گا اور صاحب خانہ پر کوئی گناہ لازم نہ آئے گا۔ اس کے برعکس اگر صاحب خانہ اپنا ہاتھ باہر نکال کر فقیر کے ہاتھ پر کچھ رکھ دیتا ہے یا اس سے کچھ لے کر اپنا ہاتھ واپس اندر کر لیتا ہے تو ایسی صورت میں صاحب خانہ گنہ گار سمجھا جائے گا، فقیر پر کوئی گناہ نہ آئے گا۔ البتہ اگر فقیر اپنا ہاتھ گھر میں داخل کرے اور پھر صاحب خانہ کچھ اس میں سے لے لے یا اس میں کچھ ڈال دے تو ایسی صورت میں دونوں گناہ سے بچ جائیں گے۔ اسی طرح اگر صاحب خانہ اپنا ہاتھ باہر نکالے فقیر اس میں سے کچھ لے لے یا اس میں کچھ رکھ دے اور پھر صاحب خانہ اپنا ہاتھ اندر کرے تو ایسی صورت میں دونوں گنہ گار ہوں گے۔[۲۵] تورات کے ایک سیدھے سادے حکم پر فقہی موشگافیوں کے اس طریقے نے نہ صرف یہ کہ اس مسئلے کو پیچیدہ بنا دیا بلکہ ایسے طریقے کی بھی نشاندہی کر دی جس کو بروئے کار لا کر دونوں فریق گناہوں سے بچ سکتے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ تفقہ کے پردے میں احکام کی تنسیخ کا ایک مذموم طریقہ کار ہے۔ ہمارے یہاں بھی اہلِ علم کی کتابوں میں حیل کے حوالے سے اس قسم کی بحثوں کا وافر بیان موجود ہے۔ ہم یہاں مثال کے لئے صرف امام غزالی کی کتاب ''کیمیائے سعادت'' سے ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ امام موصوف اس بات کے قائل ہیں کہ جھوٹ بولنا حرام ہے کہ یہ دل پر اثر کرتا اور اسے تاریک کر دیتا ہے۔ البتہ کوئی آدمی اگر اس طرح جھوٹ بولے کہ وہ از راہ مصلحت ہو اور دل سے اسے مکروہ سمجھتا ہو تو پھر حرام نہیں۔ اس لئے کہ بقول امام موصوف وہ جب خیر کے ارادے سے جھوٹ بولے گا تو دل تاریک نہ ہوگا۔[۲۶] امام شعبی کے حوالے سے آپ نے لکھا ہے کہ حضرت شعبی کو جب کوئی بلاتا تو لونڈی کو فرماتے کہ دروازہ میں ایک دائرہ کھینچ کر اس کے بیچ میں انگلی رکھ کر کہہ دو کہ حضرت یہاں نہیں ہیں۔ یا پھر کہہ دو مسجد میں تلاش کرو۔[۲۷] بعض لوگوں نے اس فعل کو وسعت دے کر بعض فرائض میں بھی اپنے لئے تخفیف کی راہ ہموار کر لی۔ اکبر کے دربار میں معروف عالم دین مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کا اپنے آپ کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دینے کے لئے سال کے آخر

میں اپنی تمام دولت بیوی کے نام ہبہ کرنے اور پھر اسے زبانی ہبہ کے ذریعہ واپس لوٹانے کا عمل اس حیلے کی بہترین مثال ہے جس کے ذریعہ عین فقہی طریقۂ کار سے مقاصد شرع کو معطل کیا جانا ممکن ہے۔

وحی کے گرد فقہ کے حصار نے نہ صرف یہ کہ دین کو کتاب احکام بنا کر رکھ دیا بلکہ انسانی فہم کو تشریح وتعبیر کا کلی حق دینے اور استنباط کے انسانی طریقۂ کار کو نا قابلِ خطا (unfailing) اور فائنل سمجھ لینے کے نتیجے میں مختلف طریقۂ کار نے، اور بعض اوقات ایک ہی طریقۂ کار نے، مختلف قسم کے مباحث کو جنم دیا جس سے بسا اوقات سخت قسم کے فقہی اختلافات پیدا ہو گئے۔ ایک ہی مسئلے پر مختلف فقہاء کے یہاں متضاد اور متحارب رائے پائی گئی۔ عام لوگوں کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ خدا کا اصل حکم کون سا ہے؟ قرآن کو واقعی کیا مطلوب ہے؟ جس طرح تلمود میں ایک ہی مسئلے پر مختلف آراء کا پایا جانا اہل یہود کو خاص رحمت اور عافیت معلوم ہوتا تھا کہ ان کے لیے اس طریقۂ کار سے وحی میں اپنی پسند کا خیال دریافت کرنا آسان ہو گیا تھا۔ تقریباً وہی صورت حال ائمہ اربعہ کی فقہ میں پیدا ہو گئی۔ مثال کے طور پر تعلیم نسواں کے مسئلے پر ایک تلمودی عالم کا خیال ہے کہ ہر شخص پر اپنی بیٹیوں کو تورات کی تعلیم دینا لازمی ہے۔ لیکن دوسرا فقیہ کہتا ہے کہ جو شخص اپنی بیٹی کو تورات کی تعلیم دیتا ہے وہ گویا اسے فحاشی سکھاتا ہے۔ ایک یہودی فقیہ کا خیال ہے کہ تورات کے اس جملے Ye shall teach them your children (Deut XI-19) کا مطلب صرف لڑکوں کی تعلیم ہے، لڑکیوں کی نہیں۔ اور یہ کہ تورات کے الفاظ، بہتر ہے کہ آگ میں جلا دیے جائیں بجائے اس کے کہ اس کی تعلیم عورت کو دی جائے۔[۲۸] اس قسم کے متضاد خیالات میں دونوں رائے تو یقیناً تورات کی نہیں ہو سکتی، البتہ اس طریقۂ کار میں یہ سہولت ضرور موجود ہے کہ ہر شخص اپنی پسند کی رائے تلمود سے اخذ کر سکتا ہے۔ عورت کی تعلیم کا قائل بھی تلمود کا سچا پیرو ہے اور جو اس کی مخالفت کرے وہ بھی۔[۲۹] اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے جنسی تعلقات منقطع کرنے کی قسم کھالے تو شمائی مکتب فکر کے مطابق اسے دو ہفتے میں رجوع کر لینا چاہئے، اگر وہ رجوع کرنا چاہتا ہو۔ لیکن حلل کا مکتب فکر ایک ہفتہ سے زیادہ مہلت نہیں دیتا۔[۳۰] تورات میں طلاق کے جواز میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کی آنکھ میں الفت و محبت کی کوئی رمق نہ دیکھے اور اس میں indecency پائے تو وہ اسے طلاق دے سکتا ہے۔[۳۱] مشناۃ میں

اس حکم پر جو تشریح ملتی ہے وہ اس سارے اصول کو خاصا پیچیدہ بنا دیتی ہے۔ شمائی مکتب فکر کے مطابق جب واقعتاً کسی indecency کا صدور نہ ہو طلاق کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔ لیکن اس کے برعکس Hillel کے مکتب فکر کا کہنا ہے کہ اگر وہ کھانا پکانے میں بدسلیقگی کا مظاہرہ کرے تو اسے بھی indecency میں شمار کیا جائے گا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر ربائی اکیوا (Akiva) تو اس مفہوم کو یہاں تک وسعت دیتے ہیں کہ اگر اس سے کوئی دوسری خوبصورت عورت دستیاب ہو جائے تو اس کی بدصورتی بھی indecency میں شمار کی جائے گی اور مرد کے لیے طلاق کا جواز فراہم ہو جائے گا۔[۳۲] یہ اور اس قسم کے اختلافات خود ہماری فقہ کی کتابوں میں وافر مقدار میں موجود ہیں۔ احناف کے یہاں اگر تین طلاق معاشرتی زندگی کا انقطاع کر دیتی ہیں تو اہل حدیث کے نزدیک ان کی حیثیت صرف ایک طلاق کی ہے، جس سے معاشرتی زندگی کے احیاء کا امکان برقرار رہتا ہے۔ حتیٰ کہ فرض نمازوں کی ادائیگی میں بھی ائمہ کی فقہ نے سخت اختلافات پیدا کر دیے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک فرض نماز کی صرف پہلی رکعتوں میں قرأت فرض ہے لیکن امام شافعی کے نزدیک تمام رکعات میں قرأت فرض ہے، اس کے برعکس امام مالک پہلی تین رکعتوں میں قرأت فرض قرار دیتے ہیں جبکہ حسن بصری کے نزدیک صرف پہلی رکعت میں قرأت فرض ہے، وغیرذالک۔ فقہی تعبیروں میں جس کا جی چاہے اپنی پسند کے امام اور اپنی پسند کی تعبیر کو اختیار کرے۔ البتہ بعض علماء اس بات کی شرط لگاتے ہیں کہ رخصت کی خاطر مختلف مکاتب فکر سے مختلف چیزوں کا انتخاب مناسب نہیں۔ ان کے نزدیک کسی ایک مکتب فکر کی جم کر پیروی کرنا لازم ہے، حالانکہ اگر یہ تمام فقہی مکاتب فکر اپنے تمام تر ابعاد کے ساتھ وحی الٰہی کی مستند تعبیریں ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے باہمی اختلاط کو روا نہ رکھا جائے یا ان کے مشترکہ انتخاب کو فرار یا رخصت کے رویے پر محمول کیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ وحی جب فقہ کی سطح پر جلوہ گر ہوتی ہے یا اسے روشنی کے طور پر برتنے کے بجائے مدوّن قانون کی شکل دی جاتی ہے تو اس میں انسانی ذہن کی نارسائی اپنی تمام تر ابعاد کے ساتھ رونما ہو جاتی ہے، پھر وہی روشنی جو کبھی انسانوں کو آگے آگے راستہ دکھاتی تھی اس کے پیروں کی بیڑیاں بن جاتی ہے۔ اہل یہود نے تلمود کی شکل میں اپنے پیروں میں بیڑیاں ڈال رکھی تھیں، فقہائے یہود کے قیل وقال سے ان کی روحانی زندگی کا چراغ جس طرح گل ہو چکا تھا صرف form ہی form باقی رہ گیا تھا، علم تھا لیکن روشنی سے خالی

{مثلهم كمثل الحمار يحمل اسفارا﴾ (الجمعہ:۵) میں دراصل اسی کیفیت کا بیان ہے۔ رسول عربی کا کام اہل یہود کو اس بوجھ سے نجات دلانا تھا جوانہوں نے خود وحی کی اپنی من مانی تشریح و تعبیر کے ذریعہ اپنے اوپر ڈال رکھی تھی اور جو تحلیتِ وحی ہرگز نہ تھا:﴿ويضع عنهم اصرهم والاغلال التي كانت عليهم﴾ (الاعراف:۱۵۷) لیکن افسوس کہ جس بوجھ سے نجات دلانے کے لئے نبی اس دنیا میں آیا تھا خود اس کی اپنی امت نے وحی کے چشمۂ صافی پر تعبیرات کا ایک ایسا حصار کھڑا کر دیا جس کا توڑ ثانی نفسہٖ ایک بڑا چیلنج ہے۔

اسلام میں مشناتی ادب کے ارتقاء اور وحی کے گرد انسانی فہم کا حصار کھڑا کر دینے سے وہی صورت حال پیدا ہوگئی جو اس سے پہلے سابقہ امتوں کے ساتھ پیش آ چکی تھی اور جس کی ایک روشن مثال اہل یہود تھے۔ تاریخی اعتبار سے یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اس خطرے کا احساس عین ابتدائے اسلام میں کبار صحابہ کو ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شیخین کے عہد میں مسلم معاشرہ روایت کے بیان میں انتہائی احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ اس وقت سنت کا مفہوم سنت متواترہ تھا جسے مسلم معاشرہ وحی کی تشریح و تعبیر کا حتمی اور مستند قالب سمجھتا تھا۔ لیکن جب بعد میں خبر آحاد کی روایتوں نے اختلافات کی صورت حال پیدا کر دی تو حضرت عمرؓ کو اس سلسلے میں سخت موقف اختیار کرنا پڑا۔ حتیٰ کہ جو لوگ اقوال رسولؐ کی جمع و تدوین میں غیر معمولی جوش و خروش کا اظہار کر رہے تھے ان کو حضرت عمر نے اس تنبیہ کا حق دار جانا کہ لوگو! ایسا نہ ہو کہ تم لوگ دین محمدی میں ایک نئے مشناۃ کی بنیاد ڈال دو۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ صدیق نے اقوال رسولؐ پر مشتمل کوئی پانچ سو احادیث کا ایک تحریری مجموعہ تیار کر لیا تھا لیکن ایک ایسے عمل کو جس کی خود آپؐ نے اجازت نہ دی تھی انجام دینے کی وہ ہمت نہ جٹا سکے۔ مؤرخین بتاتے ہیں کہ بہت کچھ غور و فکر کے بعد بالآخر آپ نے اس مسودے کو تلف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

وحی کو انسانی فہم اور فنی مباحث کے تابع کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وحی جو کبھی زمین و آسمان کے رشتے سے عبارت تھی اور جس کی روشنی سے مستقبل کا راستہ روشن ہوتا تھا ایک بے جان تہذیبی ورثے میں تبدیل ہوگئی۔ متقدمین اور بالخصوص ائمہ اربعہ کے فہم کو حرف آخر سمجھ لینے کے نتیجے میں امت پر زندہ ذہنوں کے بجائے مرحوم روحوں کی حکومت ہوگئی، جو اپنے تمام تر تفکر و تدبر اور بیداری قلب و نظر

کے باوجود حال اور مستقبل میں دیکھنے سے قاصر تھے۔نتیجہ یہ ہوا کہ وحی کی تجلی منجمد اور بے جان رسومات کی نذر ہوگئی اور جب ایک بار وحی کا آفتاب اوہام وتقلید کے بادلوں میں چھپ گیا تو امت کو اپنی راہ کے گم ہوجانے کا احساس فطری تھا۔ یہ وہی معروف طریقہ کار تھا جس پر چل کر پچھلی امتیں اپنے منصب سے معزول ہوچکی تھیں اور جس کے بارے میں تفصیلی مباحث امم سابقہ کے حوالے سے بہ تکرار وتواتر وحی ربانی میں موجود ہے۔اس تاریخی پس منظر میں کہ جو امت یہود اور امت مسلمہ کا ہے،اگر ان قرآنی تبصروں پر نگاہ ڈالی جائے تو اسباب زوال کی تفہیم کچھ زیادہ مشکل نہیں رہ جاتی۔

امت مسلمہ سے پہلے امت مامور کے منصب پر بنی اسرائیل فائز تھے جیسا کہ قرآن میں وارد ہے: ﴿یٰبنی اسرائیل اذکروا نعمتي التي انعمت علیکم واني فضلتکم علی العالمین﴾ (البقرہ:۴۷) اللہ نے بنی اسرائیل کو خیر امت کے منصب پر فائز کیا اور اس منصب عظیم کے حوالے سے ان سے وہ میثاق لیا جس کا تذکرہ قرآن اس طرح کرتا ہے: ﴿وإذ اخذنا میثاقکم لاتسفکون دمائکم ولا تخرجون أنفسکم من دیارکم ثم اقررتم وأنتم تشھدون۔ ثم أنتم ھؤلاء تقتلون أنفسکم وتخرجون فریقاً منکم من دیارھم تظٰھرون علیھم بالإثم والعدوان ط وان یأتوکم اُسٰریٰ تُفٰدوھم وھو محرم علیکم اخراجھم، افتؤمنون ببعض الکتٰب وتکفرون ببعض فما جزاء من یفعل ذلک منکم الا خزي في الحیٰوۃ الدنیا ویوم القیٰمۃ یردون إلی اشد العذاب وما اللہ بغافل عما تعملون﴾ (البقرہ:۸۴-۸۵) خود اہل یہود کی مقدس کتاب تورات (کتاب خروج) میں اس منصب جلیل کے حوالے سے خدا کا یہ وعدہ موجود ہے کہ اگر بنی اسرائیل نے فی الحقیقت احکام الٰہی کا پاس کیا اور اس میثاق کی حفاظت کی تو وہ سارے انسانوں کے مقابلے میں خدا کے لئے ایک خزانۂ خاص ہوں گے۔[۳۳] یہ تھا وہ منصب عظیم اور یہ ہے امت سابقہ بنی اسرائیل کی عظیم الشان تاریخ جس پر عہد سابق میں ہونے والے فضل الٰہی کا تذکرہ بکثرت قرآن میں موجود ہے۔ یہ اعزاز کہ کسی امت کو تمام عالم پر فضیلت دی جائے،اسے اللہ تعالیٰ کار نبوت کے لئے منتخب کرے کوئی معمولی بات نہیں۔اہل یہود کی مقدس کتابوں میں اس فضیلت کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ نے دنیا کی تمام قوموں کو دعوت عام دی کہ کون ہے جو اس کتاب کو قبول کرے،لیکن اس بھاری ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے اہل یہود

کے علاوہ کوئی اور قوم تیار نہ ہوئی کتاب خروج کی آیت (۲۴:۷) کی تشریح یہودی علماء اسی انداز سے کرتے ہیں۔ ہر سینا گاؤگ میں تورات مقدس کی تلاوت سے پہلے اہل یہود جو دعاء پڑھتے ہیں اس میں بھی ان کی قومی عظمت کا سبب تورات کے حوالے سے بتایا جاتا ہے: یارب ذوالجلال صرف تو ہی حمد کے لائق ہے، کائنات کا بادشاہ جس نے ہمیں تمام قوموں پر فضیلت دی اور ہمیں تورات عطا کیا[۳۴] اس بات کے تو اہل یہود بھی قائل ہیں کہ تورات ان کی زندگی کا انمول خزانہ ہے اور یہ کہ اس کے حوالے سے تمام عالم پر ان کی برتری قائم ہے۔ یہی وہ دستاویز ہے جو انہیں امت منتخبہ یا خیرامت کے منصب پر فائز کرتی ہے۔ البتہ تورات کی ان تمام تر فضیلتوں کے باوجود، جو اہل یہود کے عقیدے کا لازمہ ہے، امر واقعہ یہ ہے کہ ان کی پوری تاریخ تورات سے براہ راست روشنی حاصل کرنے کے عمل سے خالی ہے۔ اولاً انہوں نے اصل تورات کو ضائع کر دیا کہ خود یہودی محققین اور علماء کے مطابق موجودہ تورات معبد کے دوسرے انہدام (70AD) کے بعد کی پیداوار ہے۔ خمسہ موسوی کی آخری کتاب (Deuteronomy) کے آخری حصے میں اس بات کی اندرونی شہادت موجود ہے کہ یہ صحیفے اصل تورات کو محفوظ کرنے کی کوششوں کے نتیجے میں وجود میں آئے ہیں۔ گویا الواح موسیٰ کے ذریعہ وحی کی راست تجلی جو بنی اسرائیل کے حصے میں آئی تھی وہ بڑی حد تک ضائع ہو گئی۔ ثانیاً جو کچھ زبانی طور پر یا نامکمل اور ناقص مسودات کے ذریعے پانچ کتابوں کی شکل میں محفوظ کیا گیا تھا اس پر بھی علمائے یہود نے قیل وقال کا وہ بازار گرم کیا کہ حضرت مسیح کو کہنا پڑا کہ اے ریا کار فقیہ اور فریسیو: تم مچھر چھانتے اور اونٹ نگل جاتے ہو[۳۵] رہی سہی محرف وحی کے گرد انسانی تشریح وتعبیر کا حصار اتنا سخت ہو گیا کہ بسا اوقات مطالب وحی ان فقہی موشگافیوں میں دفن ہو گیا اور انسانی ذہن کی معرکہ آرائیاں اس پر غالب آگئیں۔ ایک ایسی صورت حال پیدا ہو گئی جو قرآن کے الفاظ میں ﴿**یحرفون الکلم عن مواضعه ویقولون سمعنا وعصینا واسمع غیر مسمع وراعنا لیّاً بألسنتهم وطعناً في الدین**۔﴾ (النساء:۴۶) کے مصداق تھی۔

جب وحی کی روشنی ہاتھوں سے پھسلنے لگے تو کوئی وجہ نہیں کہ جو امت اسی حوالے سے منصب فضیلت پر فائز کی گئی ہو اس کی معزولی عمل میں نہ آئے۔ بنی اسرائیل کو صورت حال کی نزاکت سے بار بار خبردار کیا گیا اور انہیں اس عذاب الٰہی سے ڈرایا گیا جو کسی امت مامور کی پے در پے غلطیوں اور سرکشیوں کے نتیجے

میں ان پر مسلط کیا جانا مقدر ہوتا ہے۔ کتاب عموس میں ان تنبیہات کا بڑا لرزہ انگیز بیان ملتا ہے کہ کس طرح سرکشوں پر خدا کی زمین تنگ کر دی جاتی ہے۔ کہ خدا زبردست قوت والا ہے وہ تو کوہِ کارمل کی چوٹی پر چھپے باغیوں کو بھی تلاش کر لائے گا اور اگر وہ سمندر کی تہہ میں جا چھپیں تو سانپ کو حکم دے گا کہ وہ اسے ڈسے۔ اور قیدی بن کے دشمنوں کے سامنے جائیں تو وہ تلوار کو حکم دے گا کہ وہ اسے قتل کر دے۔ کتاب عموس کے بیان کے مطابق خدا کہتا ہے کہ ایسے لوگوں کی طرف میں نگاہ بد کروں گا اور نیک نظر نہ کروں گا۔[۳۶] وہی امت مامور جو کبھی امامت عالم کے منصب پر فائز ہوتی ہے، بدعہدی اور سرکشی کے نتیجے میں ایک ایسی صورت حال میں جا پہنچتی ہے جہاں خشکی اور تری کہیں بھی اسے پناہ نہیں ملتی اور جن پر خدا نگاہ غلط انداز بھی ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ قرآن کے الفاظ میں ﴿**ضربت علیهم الذلة والمسكنة وباؤوا بغضب من اللّٰه**﴾ (البقرہ:۶۱) کی یہی وہ اذیت ناک صورت حال ہے جو معزول امتوں کا مقدر ہوا کرتی ہے۔ حاملین کتاب اگر کار نبوت سے دست کش ہو جائیں تو ذلت ولعنت ان کا مقدر بن جاتی ہے اور جس پر سے اللہ اپنا دست شفقت اٹھا لے بھلا اس کی مدد کو کون آ سکتا ہے: ﴿**اولئك الذين لعنهم الله ومن يلعن الله فلن تجد له نصيرا۔**﴾ (النساء:۵۲)

اب تک کے مباحث میں ہم نے صرف ان امور پر روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح وحی کی تجلیٔ ربانی انسانی تعبیرات کے زیرِ اثر خیر امت کو ﴿**مغضوب علیهم**﴾ میں تبدیل کر سکتی ہے۔ ہم نے کسی حد تک وضاحت سے یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ مختلف تاریخی اور تہذیبی وجوہات کی بنا پر کس طرح اہل یہود کی طرح ہمارے یہاں بھی انسانی تعبیرات کا حصار سخت ہوتا گیا یہاں تک کہ ایک ایسی صورت حال پیدا ہوگئی کہ جمہور امت کا رویہ وحی ربانی کی طرف تاریخ وروایات اور متقدمین کی فہم کا تابع ہو کر رہ گیا۔ راست اکتساب ایک خطرناک خیال اور مذموم بدعت بن گئی، سلف کی تعبیرات حرف آخر ٹھہریں، اور زندہ لوگوں کے لیے وحی کی شمع سے اپنے دل ودماغ کو منور کرنا ممکن نہ رہا۔ مشناۃ، مدراش، حلاقہ، یا کبالائی طریقۂ تعبیر اور ان کے اسلامی version ہماری تہذیبی اور تاریخی سرزمین میں کچھ اس طرح اگ آئے کہ ان پر اجنبی ورثے کا گمان بھی نہ ہوا۔ دیکھتے دیکھتے وحی کی تابانی ضخیم مجلّات، پیچیدہ اصول فقہ، غیر ضروری کلامی بحثوں اور رجال کی تحقیق وتفصیل میں چھپ گئی۔ تاریخ وروایات، منطق وفلسفے اجنبی خیالات وافکار نے مذہبی فکر میں کچھ اس طرح اپنی جگہ بنائی

کہ متعلقات یا معاون علوم، اصل علم دین قرار پا گئے جن کو عبور کیے بغیر وحی تک پہنچنا دشوار ہو گیا اور خود چونکہ ان علوم کے منہج میں فطرتاً معاون اور معلوماتی علوم کو عبور کرنا ممکن نہ تھا اس لیے بہرصورت وحی کی تجلیوں سے اپنی راہوں کے منور کرنے کے رجحان نے دم توڑ دیا۔ ایک ایسی صورت حال میں یہ ممکن نہ تھا کہ اپنے نظری اور الہامی سرمائے سے دست کش ہونے یا بالفاظ دیگر اسے انسانی فہم میں محصور کر دینے کے باوجود امت مسلمہ خیر امت کے منصب پر ہی فائز رہتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس متوقع زوال یا معزولی کے عمل کو سمجھنے کے لیے ان نظری التباسات اور انحرافات کا بیان ہو جائے جو وحی کو انسانی تشریح و تعبیر کے تابع کرنے کے نتیجے میں اہل یہود کی طرح امت مسلمہ کے اندر بھی در آئی تھیں اور جس کی وجہ سے اس حصار کو توڑ نا مشکل ہوتا گیا۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اہل یہود کی عظمت تورات کے حوالے سے قائم ہوئی تھی۔ تمام دنیا پر ان کی فضیلت کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھی کہ انہیں کارِ نبوت تفویض کیا گیا تھا۔ البتہ جب وحی کی روشنی ان کے ہاتھوں سے پھسلتی گئی اور وہ عہد شکنی کے مرتکب ہوئے تو ان کے دلوں پر قساوت نازل کر دی گئی۔ کل تک جو لوگ حاملین وحی تھے وہ اب اپنے نظری انحراف کے نتیجے میں دانستاً تحریف وحی کے مرتکب ہو گئے: ﴿**فبما نقضهم ميثاقهم لعنّٰهم وجعلنا قلوبهم قاسية يحرفون كلم عن مواضعه**﴾ (المائدہ:۱۳) وحی کی روشنی جب انہوں نے گم کر دی یا اس پر اپنی تعبیرات کے پہرے بٹھا دیے تو باہمی اختلافات کا پیدا ہونا بھی لازمی تھا۔ نصاریٰ کے حوالے سے اس باہمی عداوت کا تذکرہ قرآن میں اسی پس منظر میں بیان ہوا ہے ﴿**ومن الذين قالوا انا نصارىٰ اخذنا ميثاقهم فنسوا حظاً مما ذكروا به فأغرينا بينهم العداوة والبغضاء الى يوم القيامة**﴾ (المائدہ:۱۴)

زوال زدہ قوموں کے لیے سب سے اذیت ناک صورت حال یہ ہوتی ہے کہ وہ اس زوال کا ادراک نہیں کر پاتیں بقول اقبال:

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

احساس زیاں کا رخصت ہو جانا اذیت زوال کی انتہائی معراج ہے۔ دیکھتے دیکھتے اردگرد کے حالات

بدل جاتے ہیں۔ حالات وواقعات پکار پکار کر کہتے ہیں کہ تم اب وہ نہیں رہے جو کل تک تھے۔ لیکن خیر امت کا نشہ اور فضیلت عالم کی باتیں بآسانی حقیقتِ حال کا اندازہ نہیں ہونے دیتیں۔ معزول امتیں چونکہ وحی میں اپنی تصویر دیکھنے کے بجائے وحی کی تعبیرات میں اپنی تصویر دیکھتی ہیں اس لیے انھیں اپنے مسخ شدہ نظری حلیے کا ادراک نہیں ہو پاتا۔ متقدمین کی تعبیریں یہ بتاتی ہیں کہ خیر امت بنے رہنے کے لیے مظاہر پرستی بہت کافی ہے۔ علماء عظام نے اپنی تعبیرات میں مسلمان بنے رہنے کے لیے جو شرائط پیش کی ہیں اور جس طرح بندگی بجالانے کے لیے فقہیں مدون کردی ہیں اگر اس کی اتباع کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ تمہارے مسلمان ہونے پر شک کیا جائے، یا کارِ نبوت کے سلسلے میں تم پر کسی عہد شکنی یا بے توجہی کا الزام آئے۔ جب دین کو مدون مظاہر کا نام مل جائے تو معزول امت کے لیے نہ صرف یہ کہ اپنے زوال کا ادراک مشکل ہو جاتا ہے بلکہ اس کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آتی کہ آخر کیا وجہ ہے کہ تاریخ پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑتی جارہی ہے۔ اس کی فطری اور عملی زندگی میں بہت کچھ کھوئے جانے کا مبہم احساس تو ہوتا ہے لیکن وہ اس زیاں کو بیان میں لانے کی قدرت نہیں رکھتی۔ یہ موہوم احساس اس کی گرفت میں آتے آتے رہ جاتا ہے۔

پھر ساری توجہ اس بات پر مرکوز ہو جاتی ہے کہ عملی اور نظری دنیا کے خلیج کو تاویلات کے ذریعے کیسے پاٹا جائے۔ خیر امت ایک functional منصب ہے۔ جو امت کارِ نبوت سے دست کش ہو جائے وہ اس منصب پر باقی نہیں رہ سکتی۔ اللہ کے یہاں انعام وفضیلت کارِ نبوت سے وابستہ ہے۔ اہل یہود ہوں یا موجودہ مسلمان وہ منصب نبوت سے دست کش ہو کر اس اعزاز کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ اس سیدھی سادی حقیقت کو قبول کرنا ان امتوں کے لیے ممکن نہیں ہوتا جو وحی کے گرد انسانی تعبیرات کا پہرہ بٹھا دیتی ہیں کہ انسانی تعبیرات ﴿**یحرفون الکلم عن مواضعه**﴾ (المائدہ:۱۳) کی راہ پر لے جاتی ہیں۔ وہ جھوٹی تاویلات کے ذریعہ معزول قوموں کو حقیقتِ حال کے ادراک سے روکتی ہیں۔ وہ یہ بتاتی ہیں کہ تم اللہ کے نزدیک خزانۂ خاص ہو، خیر امت ہو، تمام عالم پر تمہاری فضیلت مسلّم ہے۔ تمہاری دنیا اگر کھوٹی ہوگئی تو کیا ہوا، آخرت تو تمہارے لئے محفوظ ہی ہے۔ تشریعی امور میں اگر تاریخ تمہارے ہاتھوں سے پھسل گئی ہے تو کیا ہوا، تکوینی امور تو اب بھی تمہارے ہاتھوں میں ہے یا کم از کم تمہاری تعبیرات سے ہم آہنگ ہے۔ صورت حال کے حقیقی ادراک کے بجائے معزول

امتوں کی فکری کاوشوں کا محور یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح ذلت ومسکنت کی اس اذیت ناک صورت حال کو ہی دنیا میں امت منتخبہ کا مقدر بتایا جائے اور خیر امت کے حوالے سے جن انعامات اور فضل کا اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے اسے دنیا سے ہٹا کر پوری طرح آخرت میں منتقل کر دیا جائے۔ نظریے کی سطح پر یہ ایک بہت بڑی تبدیلی ہے جو دراصل ایک نئی دینیات کی تیاری چاہتا ہے اور جس کے لئے ضروری ہے کہ خوش فہمیوں اور خوش خیالیوں پر مشتمل خوش عقائدگی کو رواج دیا جائے۔

عقیدہ کسی امت کے لئے mission کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کسی قوم کا عقیدہ بدل جائے یا اس کی تعبیرات میں فرق آ جائے تو زندگی کی طرف اس کے رویے میں واضح تبدیلی آ جاتی ہے۔ اہلِ یہود کے منصب فضیلت یا امتِ مسلمہ کے آخری خیر امت کے بیان سے یہ حقیقت منکشف ہوتی تھی کہ اب دنیا کی تاریخ ان امتوں کی امامت میں اپنا راستہ طے کرے گی۔ عالمی سیادت کے منصب پر پہلے اہل یہود اور پھر امت محمدی فائز کی گئی۔ آخرت میں تمام انعامات کے علاوہ خود دنیا میں سیادت وعظمت ان کا حصہ بتایا گیا۔ داؤدؑ اور سلیمانؑ کی بادشاہت، جس کے لوٹنے کی تمنا اب بھی اہل یہود کرتے ہیں، دراصل انبیاء کے ہاتھوں میں انسانی تاریخ کی لگام دینے کا بیان ہے: ﴿**یا داؤد انا جعلناک خلیفة في الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھوی فیضلّک عن سبیل اللّٰہ۔ ان الذین یضلون عن سبیل اللّٰہ لھم عذاب شدید بما نسوا یوم الحساب۔**﴾ (ص:۲۶) منصب نبوت پر داؤد کی تنصیب کے بعد ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ وحی کی روشنی میں امور مملکت انجام دیں، بالفاظ دیگر حق وانصاف پر قائم رہیں۔ اہل یہود کی معزولی کے بعد قیامت تک کے لئے خیر امت کے منصب پر امت مسلمہ کو فائز کر دیا گیا۔ دنیا کی رہنمائی کا کام اور وحی کی روشنی سے انسانی معاشرے کو منور رکھنے کا فریضہ امت وسط کے ہاتھوں میں سونپا گیا ﴿**وکذلک جعلناکم امة وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا**﴾ (البقرہ:۱۴۳) دراصل اسی غیر معمولی اور بے مثل تاریخی واقعے کا بیان ہے جب پوری کی پوری امت کارِ نبوت پر مامور کر دی گئی اور جب رہتی دنیا تک کے لئے سیادتِ عالم کا اعزاز اس امت کو منتقل کر دیا گیا۔ امتِ وسط کے الفاظ سے اسی عدل وانصاف کی طرف اشارہ مقصود ہے جو وحی کے لئے لازمۂ رحمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ وحی کو برتنے کے نتیجے میں عدل وانصاف کی کیفیت

پیدا ہوتی ہے، حقیقت پسندی اور نقد و احتساب کا رویہ پیدا ہوتا ہے اور نقد و احتساب کا یہ رویہ وحی کو تعبیرات کے پردے میں گم ہونے سے روکے رکھتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔

امت مسلمہ کو جب خیر امت کے منصب پر فائز کیا گیا تب اس کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اسے آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے صرف روحانیت یا اخلاقیات کا کوئی مجموعہ عطا کیا جا رہا ہے۔ داؤد و سلیمان کی بادشاہت اور اہلِ یہود کے تمام عالم پر فضیلت کے حوالے سے انہیں جو کچھ عطا کیا جا رہا تھا، اس سے یہ بات مترشح تھی کہ اب تا قیامت خلافتِ ارضی کا منصب ان کا حصہ ہے۔ مدینہ میں آپؐ کے داخلے کے بعد میثاقِ مدینہ کے ذریعے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ دین و دنیا کے تمام معاملات میں اب آخری رسولؐ اور اس کی امت کو final say حاصل ہے۔ وقت کی دو بڑی super powers قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کے عنقریب زوال کی پیش گوئی قرآن میں کر دی گئی تھی۔ گویا یہ بتانا مقصود تھا کہ اب نبیؐ عربی کے ظہور کے بعد دنیا کے سیاہ و سفید کا فیصلہ اسی نبیؐ اور اس کے متبعین کے ہاتھوں ہونا ہے۔ ایران و روما کی سلطنتوں کا بکھرنا طے پا چکا ہے، کہ اب خیر امت کے منصب پر محمد رسول اللہ کی امت فائز کر دی گئی ہے۔ خیر امت کا تصور دنیا و آخرت دونوں جہاں کے انعامات سے عبارت تھا۔ مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ چونکہ خدا نے ان کو آخری امت کی حیثیت سے منتخب کر لیا ہے اس لئے دنیا کی کوئی قوت اب ان کے مقابلے نہیں ٹھہر سکتی۔ سیادت ان کا مذہبی فریضہ ہے۔ ﴿وأنتم الأعلون ان كنتم مؤمنين﴾ (آل عمران:۱۳۹) کی بشارت کو وہ عملی دنیا میں پورا ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ عقیدہ کی اس قوت نے ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ایک معنویت اور مشن عطا کر دیا تھا۔ فرض منصبی میں گہرا یقین اور دنیا اور آخرت میں غلبہ و کامرانی کے وعدۂ ربانی نے ان کی زندگیوں میں ایسا جوش و خروش بھر دیا تھا کہ اس سیلاب پر دنیا کی بڑی سے بڑی قوت بھی روک لگانے کی متحمل نہ تھی۔

البتہ جب وحی کی طرف ہمارے رویے میں تبدیلی آتی گئی اور اس کے نتیجے میں ہم زوال سے دوچار ہوگئے تو خیر امت سے متعلق اپنے عقائد کو بھی حالات کے تابع کرنے کی کوشش کی۔ غلبہ و کامرانی کے الٰہی وعدوں کو اس دنیا سے آخرت میں منتقل کر کے ہم نے ایسے عقائد بنا ڈالے جو ہماری موجودہ ذلت و مسکنت کے باوجود ہمیں بآسانی خیر امت باور کرا سکیں۔ امورِ دنیا کو دوسروں کے لئے

چھوڑ کر ہم نے اپنی فضیلت کو صرف آخرت تک محدود کر دیا۔ پھر ہمارے یہاں اُن خوش عقائدگیوں نے جنم لیا جو کبھی اہلِ یہود کا طرۂ امتیاز ہوا کرتی تھیں۔ دنیا اور امورِ دنیا کو ہڈی سے تشبیہ دی گئی جسے کتے چوستے ہیں۔ ہم نے اپنے لئے بزعمِ خود آخرت کو منتخب کر لیا۔ حالانکہ آخرت کی تمام نعمتوں کی بشارت دنیا میں کارِ نبوت کی انجام دہی کے نتیجے میں دی گئی تھیں لیکن ہم نے اسے فی نفسہٖ اپنا پیدائشی حق قرار دیا۔ ترکِ دنیا کے نتیجے میں حصولِ آخرت کے نئے نئے فارمولے ایجاد ہوئے۔ ایک ایسی رہبانیت وجود میں آ گئی جس کی اہلِ نصاریٰ کے حوالے سے قرآن نے مذمت کی تھی اور جس راستے سے اہلِ نصاریٰ وحی انجیل کو چھوڑ کر فسق میں مبتلا ہو گئے تھے: ﴿**ورهبانية ابتدعوها ما كتبناها عليهم الا ابتغاء رضوان الله فما رعوها حق رعايتها فاتينا الذين آمنوا منهم اجرهم وكثير منهم فاسقون**﴾ (الحدید:۲۷)

خیر امت کو روحانی منصب قرار دینے اور انعاماتِ الٰہی کے دنیا و آخرت کے وعدے کو پوری طرح آخرت میں منتقل کرنے کے نتیجے میں امت کے رویے اور اس کے worldview میں بنیادی تبدیلی آ گئی۔ امتِ مرحومہ نے اب اپنی معزولی کو ہی عین تنصیبِ منصب قرار دے دیا۔ احساسِ زیاں چونکہ جاتا رہا تھا اس لئے دوبارہ منصبِ نبوت کی واپسی کے لئے حقیقت پسندانہ رجحان پیدا نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس یہ خیال عام ہوا کہ دنیا تو اہلِ ایمان کے ہاتھوں سے جا چکی، پھر یہ کہ فانی دنیا میں رکھا بھی کیا ہے، اہلِ ایمان کو دراصل اپنی آخرت کی فکر کرنی چاہیے جہاں ایک دائمی رحمت ان کی منتظر ہے۔ وہ تمام انعامات اور وعدے جو کارِنبوت کی انجام دہی سے مشروط تھے انہیں کارِنبوت سے de-link کر دیا گیا اور اس طرح خوش فہمیوں پر مشتمل عقائد کا ایک نیا دفتر امتِ مسلمہ کا مقدر بن گیا۔ رفتہ رفتہ یہ خوش فہمیاں اتنی عام ہوئیں کہ اسے عقائد کا سا اعتبار حاصل ہو گیا۔ یہ عقائد کچھ نئے نہ تھے بلکہ یہ وہی خوش فہمیاں تھیں جن کا شکار یہود و نصاریٰ ہو چکے تھے اور جن کی مذمت امم سابقہ کے حوالے سے قرآن مجید میں موجود تھی۔ سیادتِ عالم سے معزول امت پر جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ خیر امت، امت الامانی میں تبدیل ہوتی گئی۔

خیر امت کا لقب جو کبھی کارِنبوت سے عبارت تھا اب محض ایک group identity بن کر رہ گیا۔ امم سابقہ کی طرح جو محض یہودیت یا نصرانیت کی قومی شناخت کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھ بیٹھے

تھے، ہمارے یہاں بھی یہ خیال عام ہوا کہ ہر مسلمان دیر یا سویر، سزا یافتہ یا انعام یافتہ، گھوم پھر کر بالآخر جنت ہی میں پہنچے گا۔ حالانکہ قرآن نے صریح لفظوں میں محض group identity کے اعتبار کو ساقط کر دیا تھا: ﴿وقالوا کونوا هودا او نصاریٰ تهتدوا قل بل ملة ابراهيم حنيفاً﴾ (البقرہ:۱۳۵) کہ اسے نہ تو یہودیت مطلوب ہے، نہ ہی عیسائیت اور نہ ہی موجودہ مسلمانی۔ بلکہ اس کا مطالبہ دینِ حنیف کا قیام اور اس کی پیروی ہے لیکن یہود و نصاریٰ کی طرح ہم نے بھی یہ سمجھ رکھا ہے کہ مسلمان چونکہ خیرِ امت ہیں اس لئے رحمت و مغفرت ان کا مقدر ہے۔ حالانکہ انعامات و مغفرت کا وعدہ، نام نہاد مسلمان، نصاریٰ یا اہلِ یہود کے لئے نہیں بلکہ کارِ نبوت کے حاملین کے لئے تھا۔ لیکن جو لوگ کارِ نبوت کو محض ideological badge بنا ڈالیں ان کے لئے خدا کے انعامات اور وعدوں میں اپنے لئے ایسی گنجائش پیدا کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ ﴿يحرفون الكلم عن مواضعه﴾ (المائدۃ:۱۳) کی اس سے روشن مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ حالانکہ مختلف مقامات پر، مختلف اسالیب میں اس مفروضہ جانبداری کی نفی کی گئی تھی اور یہ بتایا گیا تھا کہ خدا کے انعامات کے مستحق اصحابِ عمل ہیں نہ کہ کوئی فرقہ یا مخصوص قوم: ﴿ان الذين آمنوا والذين هادوا والصائبون والنصارى من آمن بالله واليوم الآخر وعمل صالحاً فلاخوف عليهم ولا هم يحزنون﴾۔ (المائدہ:۶۹)

اہلِ یہود، جنہوں نے اپنی راہ گم کر لی تھی اور جو سیادت سے معزولی کے نتیجے میں ذلت ولعنت کے عذاب میں مبتلا تھے، اپنے عظیم الشان ماضی سے کچھ اس طرح چمٹے تھے کہ انہیں یہ پتہ ہی نہ چلا کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ وہ اپنی سابقہ حیثیت کے حوالے سے خود کو جنت کا مستحق سمجھتے تھے اور کبھی اگر انہیں اپنی غفلت کا خیال بھی آتا تو یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتے تھے کہ دوزخ کی آگ اول تو ہمیں چھوئے گی نہیں اور اگر ایسا خدانخواستہ ہوا بھی تو یہ سزا محدود مدت کے لئے ہوگی: ﴿وذلک بأنهم قالوا لن تمسنا النار الا اياماً معدودات﴾ (آل عمران:۲۴) حالانکہ خدا کا ان سے ایسا کوئی وعدہ نہ تھا لیکن آخرت کے سلسلے میں اس قسم کی خوش گمانیوں نے انہیں تباہی کے راستے پر ڈال رکھا تھا: ﴿وغرهم فى دينهم ما كانوا يفترون﴾ (آل عمران:۲۴)۔ فضائل کی کتابوں میں اہلِ یہود کی نجات کے حوالے سے تو اس حد تک ضمانت موجود تھی کہ حشر کے دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کسی بھی مختون اسرائیلی کو جہنم میں جانے سے روک دیں گے۔ قومی اور گروہی

شناخت کو وجہ نجات قرار دینے کے سبب اہل یہود کی نظری اور اخلاقی زندگی تباہ ہوکر رہ گئی۔ جب آخرت محفوظ ہوتو اپنی غلطیوں کی اصلاح اور خامیوں کی نشاندہی مشکل ہوجاتی ہے۔ رجوع الی اللہ کے دروازے بند ہوجاتے ہیں، وحی سے از سرنو اپنی قومی زندگی کا چراغ روشن کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ قومی زندگی کا قافلہ زوال کی شاہراہ پر بے دھڑک چل پڑتا ہے اور وہی صورت حال پیدا ہوجاتی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: ﴿**فباء و بغضب علی غضب وللکٰفرین عذاب مھین۔**﴾ (البقرہ:۹۰)

یہ تو امت یہود کی خوش فہمیوں کا بیان تھا۔ اب ذرا اس آئینے میں امت مسلمہ کی تصویر دیکھئے۔ صاف محسوس ہوتا ہے گویا ان آیات میں خود ہماری تصویر کشی کی جارہی ہو۔ کار نبوت سے دست کشی کے باوجود ہمارے یہاں جمہور مسلمانوں کے درمیان یہ عقیدہ عام ہے کہ مسلم قوم کے ہر فرد کی آخری منزل جنت ہے۔ روایات اور بزرگوں کے بیان نے اس خیال کو اتنا پختہ بنادیا ہے کہ ہم یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہمارے اعمال جیسے بھی ہوں، ہم خدا سے کئے ہوئے عہد پر قائم ہوں یا نہ ہوں، خیر امت کے منصبِ عظیم کا ہمیں پاس ہو یا نہ ہو، جب ایک بار زبان سے لاالہٰ الا اللہ نکل گیا تو جنت ہمارے لئے مقدر ہوگئی۔ کمزور روایتوں نے اس عقیدے کو مضبوط بنانے میں خاصا اہم رول انجام دیا ہے۔ اسی قبیل کی ایک کمزور روایت میں تو یہاں تک مذکور ہے کہ "**من قال لا الٰہ الا اللّٰہ دخل الجنة......**" پوچھنے والے نے پوچھا کہ کیا اگر وہ زنا کرے اور چوری کرے جب بھی؟ کہا گیا: ہاں! کہتے ہیں کہ پوچھنے والے نے تین بار پوچھا۔ جواب ملا کہ ہاں۔ خواہ یہ بات پوچھنے والے (ابوذرؓ) کو کتنی ہی گراں کیوں نہ گذرے۔[۳۷]

مولانا اشرف علی تھانوی نے ایک حدیث کے حوالے سے تو یہاں تک لکھا ہے کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ مومن بندہ کا حساب چھپا کرلیں گے۔ اس کی نافرمانی اور گناہوں کا جب بیان ہوگا، تو ایسا لگے گا کہ جیسے کہ وہ بس ہلاک ہوا۔ تب حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ جاؤ ہم نے دنیا میں بھی پردہ پوشی کی تھی یہاں بھی کرتے ہیں۔[۳۸] یہ ہے وہ جانبداری جو منصف اعلیٰ کے حوالے سے ہمارے عقیدے کا حصہ بن گئی ہے۔ اور جس کے بھروسے ہم محض اپنی قومی اور ملی شناخت کو وجہ نجات قرار دئے بیٹھے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اگر بنی اسرائیل کی نجات کے لئے تلمودی لٹریچر میں متحرک نظر آتے ہیں تو ہمارے یہاں بھی رسول اللہؐ کو شافع محشر قرار دینے کا عقیدہ در آیا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جس کی ذات عدل وانصاف میں بے مثال ہے اور جو حساب کے دن دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردے گا، قرآن کے الفاظ میں ﴿ومن یعمل مثقال ذرة خیراً یّره ومن یعمل مثقال ذرة شراً یّره۔﴾ (الزلزلة:۷-۸) ہم اسی منصف اعلیٰ سے یہ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ وہ حساب کے دن دوسری قوموں کے مقابلے میں ہماری طرف جانبداری کا رویہ اختیار کرے گا۔ حالانکہ یہ حقیقت واضح کی جاچکی ہے کہ ﴿لیس بأمانیکم ولا امانی اهل الکتاب من یعمل سوٓءًا یجز به ولا یجد له من دون اللّٰه ولیاً ولا نصیراً۔﴾ (النساء:۱۲۳) لیکن ان تمام تر وضاحتوں کے باوجود اہل کتاب کی طرح امت مسلمہ نے بھی اپنے نبی کو شفیع المذنبین قرار دے رکھا ہے۔ قرآن کی وہ آیات جو امم سابقہ کے حوالے سے اس قسم کی خوش فہمیوں کی مذمت میں وارد ہوئی تھیں انہی آیات کی تشریح وتاویل سے بالکل مختلف معانی برآمد کر لئے گئے ہیں۔

وہ دن بڑا سخت ہوگا، وہ انصاف کا دن، اس دن تمام چیزیں جیسی کہ وہ ہیں اپنی اصل حالت میں نظر آئیں گی، حقیقت بے حجاب ہوجائے گی، اس دن اس کا حضور ہوگا اور لوگوں کے اپنے اعمال: ﴿فالیوم لا تظلم نفس شیئا ولا تجزون الا ماکنتم تعملون۔﴾ (یٰسین:۵۴)۔ وہ انصاف کا دن جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص اپنے آپ کو پیش کرکے دوسرے کو نہیں بچا سکے گا۔ جب کوئی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی، نہ جرمانہ دے کر جان بخشی ہوگی اور نہ ہی کسی قسم کی مدد پہنچائی جا سکے گی: ﴿واتقوا یوماً لاتجزی نفس عن نفس شیئاً ولا یقبل منها شفاعة ولا یوخذ منها عدل ولا هم ینصرون۔﴾ (بقرہ:۴۸) اس دن نہ کوئی حمایتی ہوگا اور نہ کوئی شفیع: ﴿ماللظالمین من حمیم و لا شفیع﴾ (غافر:۱۸)

قرآن میں جہاں بھی شفاعت کا تذکرہ آیا ہے وہاں اسی بات کا اعادہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور حساب کے دن جو چیز کام آئے گی وہ لوگوں کا اپنا عمل ہوگا، نہ یہ کہ ان کی بے جا خوش گمانیاں، اس کے آگے کس کی مجال کہ اس کی مرضی کے بغیر لب کشائی کر سکے: ﴿من ذالذی یشفع عنده الا باذنه﴾ (البقرہ:۲۵۵) اس دن جب لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے خدا کے دربار کا جلال

اور اس کی ہیبت کا یہ عالم ہوگا کہ قطار اندر قطار فرشتے بھی لب کشائی کی ہمت نہ جٹا سکیں گے الا یہ کہ خود ان سے کچھ پوچھا جائے یا انہیں بارگاہِ ذوالجلال سے اذن عطا ہو:﴿یوم یقوم الروح والملائکة صفاً لایتکلّمون الا من اذن له الرحمٰن وقال صوابا﴾ (نبأ:۳۸) وہ دن جو انصاف کے حوالے سے قائم کیا جائے گا اور جس دن منصفِ اعلیٰ خود انصاف قائم کرے گا اس دن کے بارے میں یہ سوچنا کہ وہاں کوئی سفارش کام آ سکتی ہے، یا کسی کی شفاعت سے نتائج بدل سکتے ہیں، دراصل قرآن کی بنیادی تعلیمات سے انکار کے مترادف ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج امت کا ایک بڑا طبقہ، کوئی کم کوئی زیادہ، اس غیر قرآنی تصور میں یقین رکھتا ہے کہ حشر کے دن رسولؐ اللہ کی مداخلت سے نتائج تبدیل ہو جائیں گے۔

قرآن کی یہ فہمائش اپنی جگہ کہ اے نبیؐ ان سے کہہ دو کہ میں تمہارے لئے کسی ہدایت یا خسارے کا اختیار نہیں رکھتا:﴿قل انی لا أملک لکم ضرّاً ولا رشداً﴾ (الجن:۲۱) دوسروں کے لئے کیا خود اپنے لئے نبی اللہ کا محتاج ہے:﴿قل لا أملک لنفسي نفعاً ولا ضراً الا ماشاء اللّٰه ولو کنت أعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسني السوء ان أنا الا نذیر وبشیر۔﴾ (اعراف:۱۸۸) لیکن اس کے برعکس مسلم فکر وعقیدے میں رسولؐ اللہ کو شفاعت کبریٰ کے منصب پر فائز کیا گیا ہے جس کی رو سے آپؐ کے ہاتھ پر باب شفاعت کھلے گا[۳۹]۔ اس کے بعد دیگر انبیاء کرام حتیٰ کہ صالحین اور صدّیقین کے لئے بھی شفاعت میں حصہ بتایا گیا ہے۔ بلکہ بعض کمزور روایتوں میں تو ہر مسلمان کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ شفاعت کے ذریعے مجرموں کو جہنم سے نجات دلائے یا کم از کم ان کا عذاب ہلکا کروادے۔ بخاری، مسلم، ترمذی اور مسند احمد میں حضرت آدمؑ اور دوسرے انبیاء کرام کی بے بسی کا تذکرہ موجود ہے جنہیں شفاعت کا یارانہ ہوگا۔ ان روایتوں کے مطابق بالآخر رسول اللہ ﷺ، اللہ تعالیٰ کی اجازت سے شفاعت کا portfolio سنبھال لیں گے[۴۰]۔ ترمذی کی ایک حکایت کے مطابق ایک بار اللہ کے ایک فرشتے نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے دو متبادل پیش کئے یا تو شفاعت کا حق لیں یا آدھی امت کو جنت میں جانے کی ضمانت۔ اس روایت کے مطابق آپؐ نے شفاعت کا حق پسند کیا تا کہ اس سے کثیر فائدہ حاصل ہو[۴۱]۔ حضرت علیؓ سے مسند فردوس میں مروی ہے کہ جب آیت:﴿ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ﴾ (الضحیٰ:۵) نازل

ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تک میری امت کا ایک شخص بھی دوزخ میں رہے گا میں راضی نہیں ہوں گا[۴۲] ایک روایت میں زبانی مسلمانوں کو جنت کی ضمانت اس طرح دی گئی کہ اگر کوئی شخص نومولود کا نام محمد رکھے تو دونوں باپ بیٹا جنت میں جائیں گے[۴۳] کہا گیا کہ اس دن پکارنے والا پکارے گا کہ جس کسی کا نام محمد ہے وہ اس نام کی عزت وحرمت کے باعث جنت میں داخل ہو جائے[۴۴]۔ امت محمدیہ پر خدا کی جانب داری اور اس کے فضلِ خاص کے بیان میں یہاں تک کہا گیا کہ دوسری امتوں کے لئے لوح محفوظ میں یہ لکھا ہوا ہے کہ "**من اطاعه فله الجنة ومن عصى فله النار**" لیکن امت محمدیہ کے بارے میں درج ہے کہ "**امةٌ مذنبةٌ وربٌ غفور**"۔[۴۵] یہ اور اس قسم کی خوش گمانیوں کی ایک طویل فہرست ہے جس سے فضائل کی کتابیں پٹی پڑی ہیں۔ قرآن نے تو جنت کو انعام کے طور پر مومن کی منزل بتایا تھا ﴿**ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما يعلم الله الذين جاهدوا منكم ويعلم الصٰبرين**﴾۔ (آل عمران:۱۴۲) لیکن وحی کی انسانی تعبیروں نے اسے ایک قومی اور ملی مسئلہ بنا ڈالا۔ اہل یہود کی طرح مسلمانوں نے بھی ایک جانب دار خدا اور شفیع المذنبین پیغمبر برآمد کر لیا۔ دنیا ہاتھ سے نکل گئی تو کیا ہوا ان خوش گمانیوں کے طفیل کم از کم آخرت پر اپنی اجارہ داری تو قائم ہو گئی۔

اہل یہود کا یہ کہنا کہ ﴿**نحن ابناء اللّٰه واحباؤه**﴾ (المائدہ:۱۸) اور اس حوالے سے آخرت میں اپنے آپ کو خصوصی فضل کا مستحق قرار دینا دراصل اس ماضی پرستی کی طرف اشارہ ہے جو معزول اور مرحوم قوموں میں پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ حال سے فرار کی خواہش تابناک ماضی میں پناہ لینے پر مجبور کرتی ہے اور حقائق کی سنگینی انہیں اس بات پر اکساتی ہے کہ وہ اب دنیا میں دائمی ذلت کو قبول کرتے ہوئے خیر کی تمام تر توقع دنیائے آخرت میں منتقل کر دیں۔ خیر امت یا امت منتخبہ کا منصب واقعات اور حقائق کی دنیا میں اعتبار کھو دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قومی زندگی ایک طرح کے mock-play کے عمل میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ جاہ وحشم اور عزت واعتبار تو رخصت ہو جاتی ہے لیکن بھاری بھرکم اصطلاحوں کا رواج برقرار رہتا ہے۔ نبوت کی جگہ مشائخیت لے لیتی ہے اور وحی کی جگہ انسانی تعبیر فکری زندگی کا سرمایۂ کل قرار پاتی ہے۔ دیکھتے دیکھتے اولوا الامر کے منصب پر مختلف اور متضاد خیالات کے لوگ فائز ہو جاتے ہیں اور وہی امت جو کبھی وحی کی روشنی میں اتحاد واتفاق کی

زندگی گزارتی تھی اور جس کے حرکت وعمل سے وحدت کا اظہار ہوتا تھا، مختلف اولوالامر کی اطاعت میں سخت انتشار اور اختلاف کا شکار ہو جاتی ہے۔قومی زندگی کا mock-play جہاں بظاہر پوری سماجی زندگی شریعت کی اتباع کے حوالے سے سجائی جاتی ہے، بہت جلد دین اور دنیا کی تقسیم کے عمل میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ سیاسی اور سماجی زندگی غلبہ و اقتدار سے عبارت ہے اس لئے شریعت کے نام پر mock-play کو جاری رہنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اسے صرف مذہبی، بالفاظ دیگر عائلی اور روحانی زندگی تک محدود رکھا جائے۔ اہل یہود کا حلاقہ ہو یا مسلمانوں کی فقہ دونوں میں جس قسم کی تفصیلات کا بیان موجود ہے ان کا ایک بڑا حصہ عائلی یا انفرادی زندگی کی ہدایات تک محدود ہے۔ جوں جوں اقتدار سے دوری پر وقت گزرتا گیا ہے فقہائے عظام کی توجہ سماجی، سیاسی اور اجتماعی مسائل سے ہٹ کر انفرادی، عائلی اور عبادتی زندگی کی ظاہر پرستی پر مرکوز ہوتی گئی ہے۔ اہل یہود کی فقہ میں اگر Kosher کی بحث پر طویل ابواب اور بے شمار طولانی مباحث قائم کئے گئے ہیں، زبان کی ترکیبوں، جانوروں کے انتخاب اور ان کے حرام وحلال کے سلسلے میں اکتا دینے والی بحثیں موجود ہیں تو ہمارے یہاں بھی انہی موضوعات پر طول طویل بحثوں اور نکتہ شناسی کی ایک مستحکم روایت موجود ہے۔ زندگی کا ایک بڑا حصہ چونکہ ان حضرات کی دسترس سے باہر ہو گیا۔ اقتدار سے محرومی نے ان کی اجتماعی زندگی کو نظام وحی اور اس کی روشنی سے محروم کر دیا، اس لئے جو لوگ دین کے حوالے سے دنیا جینے کی خواہش رکھتے تھے ان کے لئے دینی زندگی کو انفرادی اور عائلی زندگی تک محدود کرنا پڑا۔ دین و دنیا کی تفریق کا واضح مطلب یہ تھا کہ اجتماعی زندگی میں منصب رشد و ہدایت سے وحی کا جو جبری انخلاء ہوا تھا اس صورت حال کو مذہبی جواز فراہم کر دیا جائے۔ معزول امتیں جن کے یہاں دین بمعنی فقہ یا ظاہر پرستی رائج ہو جاتا ہے ان کے لئے اس ثنویت کو قبول کرنا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ایک بار جب اجتماعی زندگی میں secularization کا آغاز ہو گیا تو دوبارہ وہیں سے رہنمائی کا حصول مشکل ہو جاتا ہے بلکہ اجتماعی عقیدہ اس ثنویت کا قائل ہو جاتا ہے کہ دین کا مطلب مخصوص قسم کی عبادتیں اور خاص قسم کی ظاہر پرستی ہے، اور بس۔

سیکولرائزیشن معزول امتوں کے لئے ایک نئے دین کی تیاری ہے، اجتماعی اور انفرادی زندگی کی ثنویت اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ اجتماعی زندگی کے بگاڑ کو مذہبی تشریح وتعبیر نہ صرف یہ کہ گوارا

کرے بلکہ اس کے لئے مذہبی جواز بھی فراہم کرے، احبار ورہبان کی فقہ اسی دور میں پیدا ہوتی ہے۔ وحی سے راست اکتساب کا چونکہ رواج باقی نہیں رہتا اس لئے یہ کافی سمجھا جاتا ہے کہ فلاں مشائخ یا فلاں ائمہ کرام کے نزدیک اجتماعی زندگی اپنے تمام تر انحراف کے باوجود قابل قبول ہے۔ {**وان منهم لفريقاً يلؤن ألسنتهم بالكتاب لتحسبوه من الكتاب وما هو من الكتاب**﴾ (آل عمران:۷۸) tongue twisting کا کھیل نہیں بلکہ کتاب سے باطل نظریات پر دلیل لانے کی طرف اشارہ ہے۔ اولوا الامر کا منصب جب مشائخیت کے زیر تصرف آجاتا ہے تو نہ صرف یہ کہ مطالب وحی کا الٹ پھیر رواج پاتا ہے بلکہ بھانت بھانت کے یہ روحانی اولوالامر اللہ کی آیات کو اور اس کے عہد کو تھوڑی قیمتوں میں بیچ ڈالتے ہیں: ﴿**ان الذين يشترون بعهد الله وأيمانهم ثمناً قليلاً أولٰئک لاخلاق لهم في الآخرة ولا يكلمهم الله ولا ينظر اليهم يوم القيامة ولا يزكيهم ولهم عذاب اليم**﴾ (آل عمران:۷۷) ان مذہبی قائدین کے اندر قساوت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ دھڑلے سے مطالب دین کے خلاف فتاوے جاری کرتے اور اسے مصالح امت اور مطالب دین باور کرانے سے نہیں چوکتے۔ یہی وہ عمل ہے جسے قرآن ﴿**فويل للّذين يكتبون الكتاب بأيديهم ثم يقولون هذا من عند الله يشتروا به ثمناً قليلاً فويل لهم مما كتبت أيديهم وويل لهم مما يكسبون**﴾ (البقرہ:۷۹) سے تعبیر کرتا ہے۔ منصب نبوت کی حامل امت اپنے تمام تر دعوئ دینداری کے باوجود جبت اور طاغوت کی اطاعت قبول کر لیتی ہے۔ یہ سانحہ کسی عام انسانی گروہ کے ساتھ نہیں بلکہ ان لوگوں کے ساتھ پیش آتا ہے جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے ﴿**ألم تر الى الّذين أوتوا نصيباً من الكتاب يومنون بالجبت والطاغوت ويقولون للذين كفروا هؤلاء اهدىٰ من الذين آمنوا سبيلاً۔**﴾ (النساء:۵۱)

سیادت عالم کے منصب سے جبت وطاغوت کی بندگی کا یہ عمل امم سابقہ کے ساتھ جس طرح پیش آیا تھا واقعات کی دنیا میں آج اسی صورت حال سے امت مسلمہ دوچار ہے۔ اجتماعی زندگی کی تباہی اور سیادت عالم سے معزولی کے بعد دین کے نام پر جس مظاہر پرستی کو ہمارے یہاں اعتبار اور سند کی حیثیت حاصل ہے اس کا تعلق آسمانی وحی سے کہیں زیادہ انسانی تعبیرات سے ہے۔ دین سے دور ایک مخالف دین تصور نے ہمارے یہاں دینی فکر میں اپنی جگہ بنا ڈالی ہے۔ گویا ایک یہودیت

ہے جو دین اسلام میں داخل ہوچکی ہے۔قوانین وفرامین کا بے روح ڈھانچہ سب کچھ قرار پایا ہے، روح رخصت ہوچکی ہے۔عوامی سطح پر دین کا جوتصور عام ہے اسے وحی سے خداواسطے کا بیر ہے۔احبار ورہبان کے تفقہ پرسوالیہ نشان لگانا ایک امر محال ہے جس کی کم ازکم موجودہ مسلم فکر میں کوئی گنجائش نہیں دکھتی۔گزشتہ چندصدیوں میں اجتہاد کے حوالے سے مسلم دنیا میں جوتحریکیں اٹھی ہیں وہ اگر انتہائی کوششوں کے باوجودکوئی راستہ بنانے میں ناکام رہی ہیں تواس کی وجہ یہی ہے کہ ابتدائی صدیوں کے canonization کوچیلنج کرنے کا ان کے اندربھی یارا نہ تھا۔اجتہاد ان معنوں میں کہ اپنے فکر کا چراغ براہ راست وحی ربانی سے روشن کیاجائے،اسی وقت کامیاب ہوسکتا تھا جب ہم اپنے تہذیبی اور فکری سرمائے پرتحقیقی اورتنقیدی نگاہ ڈالنے کی جرأت رکھتے ہوں ورنہ ائمہ اربعہ کے تفقہ کواگرمعتبرفہم کا واحد حوالہ قرار دیا گیا تو وحی کے گرد مشناتی حصار سے بچنا مشکل ہوجائے گا اور ہمارے تہذیبی اور فکری سرمائے میں جو یہودیت داخل ہوگئی ہے اس کے انخلاء پرہم قادر نہ ہوسکیں گے۔وحی کی طرف اہل یہود کی واپسی میں ایک مشکل یہ تھی کہ مشناۃ کے حصار میں وحی کے نام پر جو کچھ موجود تھا خود اس کی حیثیت بھی خالص وحی کی نہ تھی۔البتہ ہمارے یہاں تہذیبی سرمائے کے حصار میں گھرااورتاریخ و روایت کی گرد میں دبا وحی کا آفتاب اسی طرح موجود ہے۔دوسری قوموں کے برعکس ہمارا مسئلہ یہ نہیں کہ ہمارے ہاں وحی کی روشنی گم ہوگئی ہے بلکہ یہ ہے کہ کیا ہم وحی کا چیلنج قبول کرنے کا یارا رکھتے ہیں؟

تعلیقات وحواشی

۱۔ بعض یہودی اہل فکر زبانی اور تحریری تورات کو وسیع معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک خمسہ موسوی کے علاوہ پرانے عہدنامے میں Nebiim (انبیاء) اور Ketubim (تحریریں) پر مشتمل ابواب کو بھی تحریری تورات میں شامل سمجھنا چاہئے۔ جبکہ زبانی تورات مکمل یہودی فکر وفلسفہ پر محیط بتائی جاتی ہے۔ مشناۃ (Mishnah) اور گمارا (Gemarah) کے علاوہ مدراشم (Midrashim) یعنی ربائی تاویلات اور Haggadah یعنی روایتی حکایات کو بھی اس سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ تورات کے باطنی معانی کی تلاش میں تفسیری ادب کا جو ذخیرہ کبالا کی شکل میں پایا جاتا ہے اسے بھی زبانی تورات کا جز سمجھا جاتا ہے۔ تورات کے معانی ومضمرات کو اس قدر وسعت دینے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب ہر خیال کو تعبیرات کا لبادہ پہنا کر بآسانی یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ تورات میں یوں ہے، جس سے مراد عام طور پر Torahic worldview ہوتا ہے نہ کہ تورات بذات خود۔

۲۔ ''اے سعادت مند! ہم پر اور تم پر ضروری ہے کہ اپنے عقائد کو کتاب وسنت کے مطابق اس طور پر کہ علمائے اہل حق نے کتاب وسنت سے سمجھا اور اخذ کیا ہے صحیح کریں کیونکہ ہمارا تمہارا سمجھنا اگر ان حضرات کی رائے کے مطابق نہ ہو تو قابل اعتبار نہیں۔''

(محولہ محمد منظور نعمانی، تذکرہ امام ربانی الف ثانی، لکھنؤ، ۱۹۷۰ء ص ۱۵۹)

بدقسمتی سے یہی آباء پرستی ان لوگوں کے ہاں بھی سکۂ رائج الوقت ہے جو خیر سے رجوع الی القرآن کی تحریک چلا رہے ہیں:

''میرا تعلق اسلاف کے ساتھ ہے اور اسلاف سے خود کو کاٹ دینا ہلاکت کے مترادف ہے۔ یہ میری پختہ رائے ہے اور میں اس پر جازم ہوں کہ کسی مسئلہ پر اسلاف کی متفقہ رائے سے اختلاف خواہ وہ کسی ایک مسئلہ میں ہی کیوں نہ ہو، انتہائی خطرناک ہے۔ اسی طرح فتنوں کا آغاز ہوتا ہے۔''

(ماہنامہ میثاق لاہور، ستمبر۱۹۸۴ء)

۳۔ صوفیاء کے ملفوظات میں سند کے بغیر براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے احادیث روایت کرنے کا رجحان عام ہے۔ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے ہر اچھی بات کو حدیث رسول قرار دینے کے کلیہ پر عمل کیا ہو۔ البتہ اس طریقۂ کار نے بسا اوقات اسلام کی بالکل ہی مختلف تصویر ہمارے سامنے پیش کی۔ بعض اوقات ان حضرات کی جرأت پر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح انھوں نے محض اپنے وہم وگمان سے ان باتوں کو بیان کرنے کی کوشش کی جس کا اللہ کے علاوہ کسی کو علم نہیں۔ معین الدین اجمیری نے اپنے پیر عثمان ہارونی کے حوالے سے ایک حدیث نقل کی ہے جو اس جسارت کی ایک عمدہ مثال ہے:

''رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ آپ ہمیں اہل جنت کے خورد و پوش سے خبر دیجئے۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے مجھ کو اس ذوالجلال والاکرام کی جس نے مجھے پیغمبری دی ہے کہ مرد بہشت میں سو مرتبہ کھانا کھائے گا اور سو ہی مرتبہ اپنی عیال داری سے محبت کرے گا۔ کسی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جب اس قدر کھانا پینا ہوگا تو انھیں قضائے حاجت بھی ہوگی یا نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، وقت قضائے حاجت شکم سے ایک ریح خارج ہوگی جس کی خوشبو مشک کو ماند کرتی جائے گی۔''

(انیس الارواح، ملفوظات عثمان ہارونی، مرتبہ معین الدین اجمیری)

۴۔ مشناۃ، کتاب حقیقت

۵۔ **فانه آخذ من المعدن الذی یاخذ منه الملک الذی یوحی به الی الرسول**

(محی الدین ابن عربی، فصوص الحکم، قاہرہ، ۱۳۹۵ھ، ص ۴۳)

۶۔ بخاری، باب العلم

۷۔ ہمارے خیال میں مسلمانوں میں قرآنی نقوش تعویذ اور عملیات کا پورا دبستان یہودیت کے زیر اثر پروان چڑھا ہے۔ یہودیوں میں یہ تصور عام تھا کہ عبرانی زبان کے ابجد کو اگر ایک خاص طریقے سے ترتیب دیا جائے تو تورات کے باطنی معانی نکل آتے ہیں۔ ہندسوں میں باطنی تاثیر ہے بشرطیکہ اس کے ترتیب کا ہنر معلوم ہو۔ (Sephiroth (numerical emanation دراصل خدا

کے مختلف وصف کا بیان ہے۔ چونکہ خدا نہ نر ہے نہ مادہ اس لئے اس میں دونوں ہی شکلیں پوشیدہ ہیں۔ خدا ایک رأس الاعداد ہے جس میں تمام دوسرے نمبرات پوشیدہ ہیں ایک سے دس تک کے تمام نمبرات بہشتی انسان آدم کی تخلیق میں موجود ہیں۔ قبالا کے مطابق بہشتی انسان آدم کی تخلیق سے پہلے جو دنیا معرض وجود میں آئی تھی وہ اس لئے باقی نہیں رہ سکی کہ اس میں عددی توازن کا فقدان تھا۔

تورات کے صوفی شارحین کے مطابق تورات خدائے ذوالجلال کا ایک نسوانی پیکر ہے جسے معانی کی چار سطحوں پر سمجھا جانا چاہئے۔ وہ چار سطحیں اس طرح ہیں: لفظی یعنی (peshat) رمزی (remez) تمثیلی (derash) اور سرّی (sod)۔ کتاب پیدائش میں تخلیق کائنات سے متعلق بیانات کو متصوفین نے کچھ اس انداز سے سمجھا گویا خدا نے کائنات کی تخلیق الفاظ کے سہارے کی ہو۔ اس خیال کے مطابق تخلیق کا سارا کاروبار تین الفاظ کے سہارے ترتیب دیا گیا ہے۔ (الف/ ہوا، میم/ پانی اور شین/ آگ) انسان کی سانس میں اور کائنات کی رگ وپے میں ان ہی تین حرفوں کا کمال جاری ہے۔ اس خیال کے مطابق ان تین بنیادی حرفوں پر توجہ اور مراقبہ انسان کو کائنات اور اس کے خالق کے ساتھ ایک روحانی رشتے میں منسلک کر سکتا ہے۔ ان تین حرفوں کو محض ترسیل معانی کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے اسے ذاتِ باری سے رشتۂ وحدت میں پیوست ہونے کا آلہ سمجھنا چاہئے۔ عبرانی حرفوں کے مختلف متعینہ اعداد اور اس کی سرّی قوتوں پر یقین نے اہلِ یہود کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ ان حرفوں کی سرّی قوتوں کے سہارے نہ صرف یہ کہ وہ قربِ الٰہی کے حقدار ہو سکتے ہیں بلکہ ان کی ترتیبی قوتوں کا راز حاصل کر لینے کے بعد سالک فی نفسہ تجربۂ ربانی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

اپنے پیش رو ربائی اکیوا کی طرح، ابرہیم ابوالعافیہ اس روحانی تجربے کے بارے میں اس طرح گویا ہیں:

"حرفوں پر سخت توجہ اور مراقبہ کے بعد تمہیں ایسا محسوس ہوگا تمہارے سر کے بال اپنی جڑوں پر سیدھے کھڑے ہو گئے ہیں...... تمہارے خون میں ارتعاش ہو گیا ہے...... اور تمہارا تمام جسم لرز رہا ہے، تمہارے اعضاء مضمحل ہو رہے ہیں اور...... تمہیں ایسا محسوس ہوگا گویا کوئی اضافی روح تمہارے اندرون میں وجود میں آ گئی ہو...... جو تمہیں اندر سے مضبوط کرتی اور تمہارے وجود میں سرایت کرتی جاتی ہو...... گویا کوئی خوشبودار روغن ہو جس کی سوگندھ

سر سے پیر تک چھا گئی ہو۔''

(Abraham Abulfia, Sefer ha-Tzeruf, tr. Aryeh Kaplan, Bibliotheque Nationale ms. No. 774 and Jewish Theological Seminary ms. No. 1887, Quoted in Perle Besserman, *The Shambhala Guide to Kabbalah and Jewish Mysticism*, Massa-chusetts 1997, p.37)

بعض یہودی متصوفین کی تصنیفات مثلاً Sefer Yetzirah میں تین بنیادی حروف الف، میم اور شین کی ترتیب کو الٹ دیا گیا ہے۔ سالک کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ان حرفوں کا الٹی ترتیب میں وظیفہ کرے اور ساتھ ہی ان حرفوں کی ادائیگی کے وقت انہیں اپنے تصور میں ان کی اضافی صفات کے ساتھ متصور کرتا رہے۔ مثلاً شین/ آگ کو اتھل پتھل کے ساتھ، میم/ پانی کو امن طمانیت کے ساتھ اور الف کو وجود عدم (Nothingness) کی خاموشی کے ساتھ۔

قبالائی نقطۂ نظر کے مطابق کائنات کی تخلیق باری تعالیٰ کے دس احکامِ ظہور کے نتیجے میں ہوئی جیسا کہ تورات میں "And God said....." دس مرتبہ مذکور ہے اور چونکہ یہ احکام حرفوں کے شکل میں ظاہر ہوئے اس لئے متصوفین حرفوں کی سرّی قوتِ تخلیق کے قائل ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ان حرفوں کی ترتیب کا فن انھیں خدا سے جوڑ سکتا ہے بلکہ بعضوں کے نزدیک تو یہ عمل انہیں کارِ تخلیق میں بھی شریک کرسکتا ہے۔

ملاحظہ ہو: Kaplan, Aryed. *Jewish Meditation*, New York, 1985, pp.74–75

تورات کی تفہیم کے لئے قبالائی طریقۂ تفہیم حروف کے اعداد کو خصوصی اہمیت دیتا ہے۔ اس کے مطابق تورات کی یہ سریت یا یہ خصوصی علم صرف خواص کے لئے ہے۔ اس فن میں جو تین معروف طریقے ہیں وہ یہ ہیں: Gematria جس میں حروف کی numerical value اعدادی قیمت متعین کی جاتی ہے۔ دوسرا Notarikon جس میں لفظ کے پہلے اور آخری حرف کو اہم سمجھا جاتا ہے اور تیسرا Temurah جو دراصل حروف کے مخصوص ہندساتی ترتیب میں معانی کی دریافت سے متعلق ہے۔ مسلم مآخذ میں بھی علم الاعداد کا یہ اختلاف کچھ اس انداز سے پایا جاتا ہے۔ بعض لوگ جفر کو امام جعفر صادقؑ سے منسوب سمجھتے ہیں حالانکہ اس گوسفندی سے ان بزرگوں کا دامن پاک تھا۔ مسلمانوں میں علم الاعداد کا تاریخی ارتقاء اور اہل یہود کے سرمائے کا تقابلی مطالعہ اس امر کو واشگاف کرنے کے لئے کافی ہے کہ ان تمام خرافات اور اوہام کی بنیادیں دراصل یہود کے انحراف فکری میں

ہے۔حتیٰ کہ متاخرین علماءمثلاً شاہ ولی اللہ اوراشرف علی تھانوی کے ہاں یوگا انداز کی روحانی ورزشیں یا قرآنی آیات کوایک دوسرے سے ملا کر پڑھنے کی سفارش پر حیرت انگیز طور پر ربائی ادب کا اثر دیکھنے کوملتا ہے۔ جودراصل پرانے متصوفین کے ذریعہ ان تک پہونچتی ہیں۔

ذکر کا جوطریقہ شاہ ولی اللہ کے حوالے سے ہم نے تصوف کے باب میں درج کیا ہے اسے اپنے دماغ میں مستحضر کیجئے اور ذکر جلی اور خفی کے ان طریقوں کا ایک تقابلی مطالعہ تیرہویں صدی اسپین کے معروف یہودی متصوف ابراہیم ابوالعافیہ کے طریقۂ مراقبہ سے کیجئے تو یہ سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئے گی کہ صوفیانہ عبادتوں کی ترتیب وتعمیر میں اجنبی مآخذ کا کتنا وافر حصہ ہے بقول ابوالعافیہ تورات کے حروف کی حیثیت ایک ایسے سیاہ شعلہ کی ہے جوسفید پسِ منظر میں کاغذ کے صفحات پر ثبت کردیا گیا ہو۔ پوری تورات بہتّر مقدس حروف کی خاص ترتیب میں سما جاتی ہے جس کا ارتکاز Yod-Heh-Vav-Heh کے چار حرفوں میں ہے۔ ابوالعافیہ کہتے ہیں کہ ان چار مقدس حروف کو دورانِ مراقبہ اس طرح عمل میں لانا چاہئے:

> ''ہر حرف کا نام لیں اوراسے لمبی سانس میں ادا کریں دوحرفوں کے درمیان سانس نہ لیں۔ بلکہ جتنی لمبی سانس ہوسکتی ہو لیں اوراس کے بعد کی سانس میں توقف یا آرام کریں۔ ہر حرف کے ساتھ اسی طرح کریں۔ گویا ہر حرف کے ساتھ دوسانس لی جائے۔ ایک اس طرح کہ اسے بولتے ہوئے استعمال میں لائی جائے جس کے ذریعے حرف کی ادائیگی ہو اور دوسری وقفہ میں آرام کے لئے ہر حرف کے درمیان... اس طرح کہ ہر سانس اندر کی طرف ہوا کھینچنے اور باہر کی طرف اس کے اخراج پر مشتمل ہو۔ الفاظ کی ادائیگی میں سانس اندر یا باہر کرنے میں لبوں کا استعمال نہ کیا جائے بلکہ ان کی ادائیگی میں کچھ ایسی ترکیب کی جائے کہ سانس کے اخراج سے وہ ہم آہنگ ہو جائیں''

(Quoted in Perle Epstein, *Kabbalah: The Way of Jewish Mystic*, p.96)

ابوالعافیہ اور دیگر متصوفین کے یہاں مراقبے کا یہ طریقہ دراصل اس مفروضے پر قائم کئے گئے ہیں کہ انسانی جسم کے اندر قوتوں کے مختلف مراکز پوشیدہ ہیں جسے عبرانی زبان کے چار مقدس حروف کے ذریعے حرکت دی جاسکتی ہے۔ شاہ ولی اللہ یا دیگر متصوفین کے یہاں سالک کو یہ مشورہ کہ وہ روحانی مراقبے میں متصور کرے گویا فضا میں سفید بادل چھا گئے ہوں اور آسمان سے نور کی بارش ہورہی ہو

جس میں اس کا وجود بھٹکتا جا رہا ہو۔ علماء و محققین کے نزدیک زیادہ سے زیادہ ایک نفسیاتی طریقۂ تربیت شمار کیا جاتا تھا۔ البتہ بیسویں صدی میں یہودی دنیا میں سیکولر مفکرین کے ظہور میں آنے بالخصوص Gershom Scholem,Walter Benjamin,Martin Buber Franz Kafka, Moshe Idel, Isaac Bashevis Singer وغیرہ کی تحریروں نے جب سے قبالائی ادب سے سرّیت کی نقاب کھینچ پھینکی ہے ہمارے لئے یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں رہا کہ مشاہدۂ حق کی غیر قرآنی ترکیبیں اسلامی مآخذ سے دور اہل یہود کی صوفیانہ ثقافت سے مستعار ہیں بقول یہودی متصوف اسحٰق جوا کّو کی علاقائی نسبت سے معروف ہیں سالک اگر ہوا، پہاڑ اور آگ جیسے بنیادی عناصر کو اس خیال سے متصور کرے کہ اسے موسیٰ علیہ السلام کا تجربۂ مشاہدۂ حق مطلوب ہو تو وہ مراقبے کی ایک ایسی منتہا پر پہنچ سکتا ہے جب اس کی آنکھ آسمان اور زمین کو اس طرح دیکھے کہ ان دونوں کا مشترکہ تصور اسے محض ایک خلا معلوم ہو۔ اب سے چاہئے کہ وہ اس خلا میں ایک دائرہ متصور کرے اور اس دائرہ میں تورات کے مخففات ثبت کرتا جائے اور اسے یہ سب کچھ ایسا محسوس ہو گویا سفید کاغذ پر یہ حرف حقیقت کی طرح روشن ہو گئے ہوں۔ سالک کو ایسا محسوس ہوگا کہ رفتہ رفتہ روشن اور جگمگ الفاظ پر ایک ایسی دھند چھا گئی ہے جس میں کسی چیز کو ایک دوسرے سے امتیاز کرنا ممکن نہ ہو۔ یہی ہے Nothingness کا وہ مرحلہ جہاں ماوراء خدا کچھ بھی نہیں۔ عباسی بغداد اور مسلم اسپین میں علمائے یہود اور ان کے متصوفین کا جو قریبی تعامل مسلم ثقافت سے ہوتا رہا ہے اس کے پیش نظر زہاری تصوف کے اثرات ہماری منحرف فکر پر پڑنا کچھ عجب نہیں۔

۸ ہمارے نزدیک لوح محفوظ سے مراد دفتین کا ہونا اس لئے بھی قابل فہم ہے کہ نزول قرآن کے وقت اہل کتاب کے پاس الہامی تعلیمات مخصوص کتابی شکل میں محفوظ نہ تھیں۔ کوئی ایسی کتاب نہ تھی جسے کامل اور خالص وحی کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ عیسائیوں کی انجیل، اقوال عیسیٰ اور ان کی تعلیمات پر مشتمل تھیں جو ان کے حواریوں یا بعد کے شاگردوں نے جمع کیا تھا اور جسے عہد نامہ قدیم پر اضافے کی حیثیت حاصل تھی۔ رہا عہد نامہ قدیم تو یہاں بھی تورات کوئی مخصوص کتاب نہ تھی بلکہ اسے خمسہ موسوی (مقدس ترین حصے) اور تلمودی اور تشریحی ادب میں مظہر بتایا جاتا تھا۔ تورات جس کے لفظی معنی قانون کے ہیں ایک ایسی ڈھیلی ڈھالی کتاب تھی جس سے قوانین کے اخذ و اکتساب میں بڑے لبرل ازم کا اظہار کیا جاتا تھا۔ انبیائے یہود کے علاوہ یہودی ربائیوں اور مشائخ کی آراء بھی قوانین الٰہی کا اظہار بن گئی تھیں۔ بعض اسرائیلی نبی بھی قوانین الٰہی کے بجائے قوانین ربائی کا احترام کے

ساتھ تذکرہ کیا کرتے تھے۔ (دیکھئے: Malachi 2:7 اور Ezekiel 7:26) گو کہ Jermiah 8:8 اور Isaih 29:13 میں ربائی قوانین کے سلسلے میں دبی بغاوت کا اظہار بھی ملتا ہے لیکن جب بنی اسرائیل کے انبیاء لوگوں کو قوانین الٰہی کے اتباع کی دعوت دیتے ہیں تو ان کی نظر میں اس حوالے سے کسی مخصوص کتاب یا مرتب شدہ صحیفہ نہیں ہوتا۔ انبیائے یہود کی آخری کتاب Malachi اس اپیل پر ختم ہوتی ہے کہ لوگو! شریعت موسوی یا قوانین موسوی کا پاس رکھو۔ البتہ یہ شریعت موسوی کہاں پائی جاتی ہے، اس بارے میں کسی مخصوص صحیفے کی طرف یہاں بھی اشارہ نہیں ملتا۔ رہی Pentateuch کی بات تو خود یہودی محققین اس بات کے قائل ہیں اور خود خمسہ موسوی کی اندرونی شہادت سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ تمام کی تمام پانچوں کتابیں صرف تعلیمات موسوی یا وحی موسوی پر مشتمل نہیں ہیں۔ لہٰذا شریعت موسوی کے طالب کے لئے صدیوں پر مشتمل مقدس یہودی لٹریچر بشمول بائبل اور اس کے متعلقات کی چھان بین لازم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد بھی وثوق سے یہ پتہ نہیں چل سکتا، پیغمبروں اور ربائیوں کی ان تشریح و تاویل میں حق ہے کہاں اور خدا کو واقعی کیا مطلوب ہے؟ اس کے برعکس قرآن کو اس بارے میں فوقیت حاصل ہے کہ یہاں خالص اور کامل وحی دفتین میں موجود ہے۔ یہی وہ لوح محفوظ ہے جو زبانی طریقۂ روایات کے مقابلے میں قرآن مجید کو دوسرے تمام معلوم صحف سماوی سے ممیّز کرتا ہے اور یہی وہ وحی ہے جو علّم بالقلم یعنی قرطاس و قلم کے حوالے سے عطا کی گئی ہے۔

٩ مہدی، مسیح یا مجدد کی آمد کا تصور ایک اجنبی خیال ہے جس کی جڑیں اسلام کے بجائے دوسرے ادیانِ محرفہ میں پائی جاتی ہیں۔ اس مسئلہ کے ادراک کے لیے سب سے پہلے یہ حدیث ملاحظہ کیجئے:

قال رسول الله ﷺ تكون النبوة فيكم ما شاء الله ان تكون ثم يرفعها الله تعالى ثم تكون خلافة على منهاج النبوة ماشاء الله ان تكون ثم يرفعها الله تعالىٰ ثم تكون ملكاً عاضاً فتكون ماشاء الله أن تكون ثم يرفعها الله تعالىٰ ثم تكون ملكا جبرية فيكون ماشاء الله أن يكون ثم يرفعها الله تعالىٰ ثم يكون خلافة على منهاج النبوة۔ (مسند احمد والبيهقى فى دلائل النبوة......)

اور اسی قسم کی ایک اور حدیث:۔ **عن ابي عبيدة و معاذ بن جبل عن رسول الله ﷺ قال ان هذا الامر بداء نبوة ورحمة ثم يكون خلافة ورحمة ثم ملكا عضوضا ثم كائن جبرية وعتوا وفسادا في الارض يستحلون الحرير والفروج والخمور يرزقون على ذلک وينصرون**

حتی یلقوا اللہ —(**رواہ البیھقی فی شعب الایمان**)

ان دو احادیث کی روشنی میں عہدِ نبوت سے **قیام الساعۃ** تک کی تصویر کچھ یوں بنتی ہے۔ اولاً عرصۂ نبوت، اس کے بعد خلافت و رحمت اور اس کے بعد انسانی تاریخ **ملکاً عضوضاً** کے مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے۔ پھر جبری بادشاہوں کا دور ہے، **فساد فی الارض** کا ماحول ہے جس کے بعد دوبارہ اجتماعی نظام منہج نبوت پر واپس آ جاتا ہے۔ لیکن خلافت کی یہ واپسی آخری ساعت سے پہلے نہیں ہے۔ یہ بات بھی محلِ نظر رہے کہ آخری رسول کی زبانی مستقبل کی کوئی تصویر کشی گویا تاریخ عالم کی تصویر کشی ہے۔ ورنہ رسول کی حیثیت ایک قومی یا ملی نبی کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ جو لوگ اس قبیل کی حدیثوں سے مستقبل شناسی کی کوشش کرتے ہیں انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ حدیثیں عالم گیر سطح پر تاریخی انقلاب کا احاطہ نہیں کرتیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بنی اسرائیل کا کوئی قومی پیغمبر اپنی تاریخ کے بارے میں مستقبل کی طرف کچھ اشارے کر رہا ہے اور بس۔ ہمارے خیال میں سند سے قطع نظر اس قسم کی حدیثیں رسول اللہ کے مرتبے سے بہت ہی فروتر ہیں۔ یہ ساری غلط فہمی اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ ہم ملی تاریخ کو عالمی تاریخ سے الگ سمجھنے کے عادی ہو گئے ہیں اور یہ بات ہمارے ذہنوں سے محو ہو گئی ہے کہ ہم وہ لوگ ہیں جن کی مٹھی میں مستقبل کی عالمی تاریخ دی گئی ہے۔ اس حدیث کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ اس کا اطلاق عالمی تاریخ پر ہو، اموی اور عباسی حکومتوں کے تسلسل پر نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ خود اس حدیث کے مطابق خلافت علی منہاج النبوۃ، جسے یہاں دوسرے مرحلے کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے، کا عالمی سطح پر ابھی دنیا کو اس کا مشاہدہ کرنا باقی ہے۔ اس کے بعد ہی **ملکاً عضوضاً** یا **ملکاً جبریۃً** کا مرحلہ آئے گا۔ اس لئے جو لوگ آخری امت کی تاریخ کو عالمی سیاق سے ہٹا کر ایک محدود گروہی عمل کی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، انہیں یہ جان لینا چاہیے کہ خود ان کی پیش کردہ حدیثوں کے مطابق ہم ابھی اس مرحلے میں داخل نہیں ہوئے ہیں جب مسیح موعود اور مہدی آخر الزماں کے انتظار میں اپنا وقت ضائع کریں۔ ابھی تو عالمی خلافت کا مرحلہ ہی انجام نہیں پایا ہے اس سے پہلے ہی امت مامور بعض حادثے کا شکار ہو کر عملی طور پر امت معزول میں تبدیل ہو چکی ہے۔

صحیح مسلم میں ایک حدیث اس طرح نقل ہوئی ہے "**عن نافع بن عتبہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: تغزون جزیرۃ العرب فیفتحھا اللہ ثم فارس فیفتحھا اللہ ثم تغزون الروم فیفتحھا اللہ ثم تغزون الدجال فیفتحہ اللہ۔** (**رواہ مسلم**)

اس حدیث کو مستقبل شناسی کی بنیاد بنایا جائے تو اسے زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ ایران و روما کے جس زوال کی پیش گوئی قرآن میں بصراحت کی گئی ہے اور جس کا دنیا نے دس برسوں کے اندر عملی طور پر

مشاہدہ کرلیا، اس حدیث کو اسی قرآنی wisdom کا تتمہ سمجھنا چاہیے۔ لیکن جو لوگ ان حدیثوں کی بنیاد پر مستقبل شناسی کی پوری ایک discipline قائم کرنے کے درپے ہیں ان کے لئے جزیرۃ العرب میں اسلام کا غلبہ پہلا مرحلہ، سلطنت ایران کا زوال دوسرا مرحلہ اور ترکی سلطان محمد کے عہد میں قسطنطنیہ کی علامتی فتح (۱۴۵۳) تیسرا مرحلہ قرار پائے گا۔ اب آگے صرف دجال کا ظہور باقی ہے۔ اور دجال کے ساتھ ہی مہدی کا ظہور اور مسیح برحق کا نزول اس مستقبل شناسی کا لازمی حصہ ہے۔ کیا خواص اور کیا عوام، یہ بات مسلمانوں کے دل ودماغ میں بیٹھ گئی ہے کہ ہم اپنے زوال کے نتیجے میں آخری عہد سے قریب آ گئے ہیں، جہاں ظہور دجال کے ساتھ ہی غلبہ حق کا آخری مرحلہ طے ہونا باقی ہے۔ صورت حال اتنی خراب ہے کہ جو لوگ اس عہد میں دین کی انقلابی تفہیم کے حوالے سے جانے جاتے ہیں اور جنہیں احیائے دین کے ہراول دستے کی حیثیت حاصل ہے ان کے یہاں بھی مہدی آخری الزماں کا انتظار اسلامی عقیدے کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ یہ حضرات اس بات کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ اس قبیل کی خبروں کے راویوں کا پتہ لگائیں اور پھر نقد حدیث کے مسلمہ اصولوں کے مطابق ان تصورات سے امت مسلمہ کو نجات دلائیں۔ تاکہ ہم میں منہج نبوت کی تفہیم اور اس کے ذریعے دوبارہ منصب سیادت پر مامور ہونے کا داعیہ پیدا ہو سکے۔

مہدی آخری الزماں کی آمد ہو یا مسیح موعود کے ظہور کا مسئلہ، امام غائب کا انتظار ہو یا مستقبل کے مجدد کی تلاش۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ تصورات ختم نبوت سے براہ راست متصادم ہیں۔ آنے والا آچکا ہے۔ اب اس کے بعد کوئی نہ آئے گا۔ زمین کا آسمان سے رابطہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہو چکا ہے۔ اب جو کچھ کرنا ہے اسی امت کو کرنا ہے جس کے لئے کتاب محفوظ کے حوالے سے ﴿انا له لحافظون﴾ کا وعدہ ہے اور بس۔

لیکن مصیبت یہ ہے کہ بڑے بڑوں کے دماغ پر ایک نئے نبی کی آمد کا انتظار کچھ اس طرح حاوی ہے کہ سنجیدہ علمی تنقید اور صدیوں سے مسلسل کی جانے والی نفی بھی ان خود ساختہ تصورات سے امت کو نجات دلانے میں ناکام رہی ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ حجۃ من بعد الرسل ہے۔ نبی کی غیر موجودگی میں صرف اس کا وجود ہی امت کو منہج نبوت پر قائم رکھنے کے لئے کافی ہے۔ اندرونی انحراف اور نظری التباس کی درستگی کا یہاں شافی سامان موجود ہے اور یہ کہ قرآن کا وعدۂ استخلاف آج بھی ان شرائط کے ساتھ امت کے لئے ایک عملی وعدہ ہے۔ لیکن ہم جو سہل پسندی کے خوگر اور آباء پرستی کے مریض ہیں ہمارے لئے خود براہ راست اس الٰہی پیغام کا سمجھنا اور اس دعوت کو قبول کرنا ایک امر صعب ہے۔ اصولی طور پر تو ہم نبوت کے دروازے کو بند سمجھتے ہیں لیکن عملی طور پر ایک چھوٹے نبی کی آمد کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ اصحاب اہل السنّت والجماعت کے وہ اہل علم بھی جو امام غائب، مہدی یا مسیح کی آمد کو اسلامی عقیدے سے متصادم بتاتے ہیں ان کے یہاں بھی مجدد کی

آمد کا جواز موجود ہے۔اور ایک larger-than-life-size قائد کے لئے یہاں بھی جگہ خالی ہے۔حتیٰ کی ابوالاعلیٰ مودودیؒ جیسا شخص بھی، جن کی اسکیم میں کسی کے لئے منصب بزرگی کا حصول ایک مشکل کام ہے، وہ بھی ایک مجدد کامل کی آمد کا مژدہ سنائے بغیر نہیں رہ پاتا۔ بقول ان کے ''مجدد کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے مگر عقل چاہتی ہے،فطرت مطالبہ کرتی ہے اور دنیا کے حالات کی رفتار تقاضا کرتی ہے کہ ایسا لیڈر پیدا ہو، خواہ اس دور میں پیدا ہو یا زمانے کی ہزاروں گردشوں کے بعد پیدا ہو۔اسی کا نام الامام المہدی ہوگا جس کے بارے میں صاف پیشین گوئیاں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام میں موجود ہیں۔'' (ابوالاعلیٰ مودودی، تجدید واحیائے دین ص ۴۹)

مثلہ معہ، امام غائب، مسیح موعود اور مجدد کے سلسلے میں ہمارے یہاں مقبول عام مجموعوں میں جو تفصیلات ملتی ہیں ان کی بنیاد پر مستقبل شناسی کا پورا فن وجود میں آ گیا ہے۔ البتہ جن لوگوں نے ان روایتوں کی سند کی جانچ پڑتال کی کوشش کی ہے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان قصے کہانیوں کو رسول اللہؐ سے دور کی بھی نسبت نہیں۔ ہمارے خیال میں مستقبل شناسی کی یہ پوری ڈسپلن یہودی مآخذ سے درآمد کی گئی ہے، جس میں تخیلاتی رنگ بھرنے میں عہد عباسی کی عجمی ثقافت کو خاصا دخل ہے۔اس بارے میں ہم تفصیلی بحث دوسرے باب میں کریں گے۔ یہاں صرف اس وضاحت پر اکتفا کرتے ہیں کہ مجدد کے سلسلے میں جو معروف حدیث ہمارے علم کا حصہ بن چکی ہے، جس کا تذکرہ ابوداؤد میں ملتا ہے، وہ سند تو درکنار خود متن کی بنیاد پر ثقہ قرار نہیں دی جاسکتی۔حدیث کے اصل الفاظ یوں بتائے گئے ہیں۔

''**عن ابي هريرة فيما أعلم عن رسول الله ﷺ إن الله يبعث في امتي على رأس كل مأة من يجدد لها دينها۔**'' (ابوداؤد کتاب الملاحم)

محدثین کے نزدیک رجال کی بنیاد پر یہ حدیث انتہائی ضعیف ہے۔لیکن روایتی علماء کا یہ اصرار ہے کہ ''ایسی بہت سی حدیثیں ہیں جن کی سند میں کلام کیا گیا ہے مگر واقعہ نے ان کی صداقت کی توثیق کر دی ہے۔ یہی حال اس حدیث کا بھی ہے اور تاریخ اسلام اس کی صداقت کی شاہد ہے۔''

(مولانا شاہ سید سلیمان ندوی فی مقدمہ تجدید دین کامل، عبدالباری لکھنؤ ۱۹۵۶ء)

اس ایک مفروضہ حدیث کی وجہ سے پوری امت کوئی ہزار سال سے اس بحث ومباحثے میں الجھی ہوئی ہے کہ کسے واقعی مجدد قرار دیا جائے۔اور کسے مجدد کامل کے منصب پر سرفراز کیا جائے۔ چوں کہ اس حدیث کی سند میں خود روایتی ثین کو کلام ہے اس لئے ہم یہاں رجال کی بحثوں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے صرف متن کے تجزیے پر امحد کتفا کرتے ہیں۔

یہ بات کہ اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر کوئی مجدد پیدا کرے گا اس لئے بھی قول رسول نہیں ہوسکتا کہ آپؐ کے عہد میں ہجری صدی کا موجودہ تصور نہیں پایا جاتا تھا۔ ہجرت کو باضابطہ کیلینڈر کے طور پر استعمال کرنے کا کام حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہوا ہے۔ اس لئے جو لوگ پہلی صدی ہجری کے آخری سرے پر عمر بن عبدالعزیز کو منصب خلافت پر سرفراز پا کر اس حدیث کی صحت کا جواز پیش کرتے ہیں انہیں اس تاریخی حقیقت کو سامنے رکھنا چاہیے۔ دوسری بات جو اس سے بھی کہیں زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ ہر صدی میں کسی مجدد کی شناخت کا کام کیسے انجام پائے گا، اس بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی گئی ہے۔ کسی ایسی بھرپور قیادت کی شناخت کا جب تک کوئی طریقہ نہ بتایا جائے اس کے ظہور سے امت کس طرح استفادہ کرسکے گی۔ اس حدیث نے بڑے بڑے اہل علم کو اس تردد میں مبتلا رکھا ہے کہ کس صدی کا مجدد کون ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے امام احمد بن حنبل نے عمر بن عبدالعزیز متوفی ۱۰۱ھ کو پہلی صدی ہجری اور امام شافعی متوفی ۲۰۴ھ کو دوسری صدی کے مجدد کے طور پر متعارف کرایا۔ اس کے بعد ہر صاحب علم نے اپنی نگاہ اور بصیرت کے مطابق مختلف اصحاب علم وفضل کو اس منصب پر فائز کیا۔ کہا جاتا ہے کہ تیسری صدی کے مجدد ابوالحسن اشعری، چوتھی کے امام الحرمین جوینی اور پانچویں کے غزالی ہیں۔ بعض حضرات نے پچھلی صدیوں کے مجدد کی شناخت کے بعد اپنا نام نامی بھی اس فہرست میں شامل کرانا ضروری سمجھا۔ جلال الدین سیوطی نے پہلی سے آٹھویں صدی تک بالترتیب عمر بن عبدالعزیز، امام شافعی، حافظ ابن شریح، امام باقلانی، امام غزالی، امام رازی، ابن دقیق العید، امام بلقینی وغیرہم کے شمار کے بعد نویں صدی میں خود اپنا نام نامی اس عہدۂ مبارکہ کے لئے پیش کردیا۔ لیکن اسی صدی میں امام سخاوی بھی ہیں جن کا دعویٰ اس منصب کے لئے برقرار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حافظ سیوطی چونکہ شافعی المسلک تھے اس لئے انہوں نے اپنے ہم مسلکوں کے نام اس فہرست میں بھر دئے ہیں۔ ہندوستان میں جہاں احمد سرہندی کو دوسرے الفیے کے مجدد اعظم کی حیثیت حاصل ہے، انہیں اس بات پر اصرار ہے کہ سو کی گنتی تو اپنی جگہ، ہزار کا بھی اپنا ایک خاص مقام ہے۔ اتنے اہم مسئلے کو طے کون کرے اور کسے منصب تجدید پر مامور سمجھا جائے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر کوئی بارہ صدیوں سے ہمارے یہاں بحث چل رہی ہے۔ جیسا کہ ہم نے عرض کیا، بعض حضرات تو کسی کو بھی مجدد کامل ماننے کو تیار نہیں ان کے مطابق ابھی ایک کامل مجدد کا ظہور باقی ہے۔ احمد سرہندی کو مجدد کا لقب ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نے دیا جو رفتہ رفتہ ان کے نام کا جز بن گیا۔ برصغیر ہندوپاک کے شیخ الاعظم مولانا اشرف علی تھانوی سے جب یہ پوچھا گیا کہ کیا حضرت مجدد وقت ہیں تو آپ نے فرمایا ''احتمال تو مجھ کو بھی ہے مگر اس سے زائد نہیں، جزم اوروں کو بھی نہیں کرنا چاہئے، ظن کے درجہ میں گنجائش ہے، باقی قطعی یقین تو کسی مجدد کا نہیں۔''

(عبدالباری، تجدید دین کامل، حوالہ مذکور، ص ۲۵)

ایک قصہ جس کا سرے سے فسانے میں کوئی ذکر نہ ہو وہ ہمارے ارباب حل وعقد کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لے کہ کوئی تو مجدد کامل کی آمد پر اصرار کرے اور کسی کو یہ ظن ہو کہ کیا پتہ جس مردے از غیب کا انتظار تھا وہ خود اس کی ذات میں جلوہ گر ہے۔ چوں کہ ہمارے یہاں تاریخ کے مطالعے میں اور اسلاف کے علمی ورثہ کے مطالعہ میں تنقیدی رجحان کے بجائے معتقدانہ رویہ کو پرورش دی گئی اس لئے جب ایک بار کوئی غلط تصور غلط حوالوں کے توسط سے قدماء کی کتابوں میں راہ پا گیا تو اس کی اصلاح کے بجائے ان غلطیوں پر مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ ہمارے خیال میں سب سے پہلے مجدد کے سلسلے میں اس حدیث کی بازگشت مامون کے عہد میں سنائی دیتی ہے جو دوسری صدی کے سرے پر مسلم دنیا کی کمان سنبھالے ہوئے ہے۔ اس عہد میں سیاسی ضرورتوں کے تحت ایسی حدیثوں کا منظر عام پر لایا جانا کچھ حیرت ناک عمل نہیں۔ صدی کے پہلے سرے پر عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے جلیل القدر شخص کی موجودگی سے ممکن ہے مامون اور اس کے حواریوں کو اس حدیث کے ذریعہ اعتبار حاصل کرنا مقصود ہو۔ امام احمد بن حنبلؒ جو اس دور میں حکومت مخالف اولوالعزم قیادت کے حیثیت سے چھائے ہوئے ہیں، ان کا یہ کہنا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے بعد دوسری صدی کے مجدد امام شافعی ہیں، دراصل مامون کو اس حدیث سے ہونے والے فوائد سے روکنے کی کوشش ہے۔

اب ذرا حضرت مسیح کی آمد ثانی کے مسئلہ کو لیجئے۔ حضرت مسیح کے بارے میں قرآن صراحت کے ساتھ ﴿متوفیک﴾ کا لفظ استعمال کرتا ہے: ﴿انی متوفیک و رافعک الی﴾ (آل عمران:۵۵) اس عالم رنگ و بو میں ہر شخص کے لئے موت مقدر کر دی گئی ہے: ''کل نفس ذائقة الموت'' دراصل اسی حقیقت کا اعلان ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک جلیل القدر پیغمبر تھے جنہیں بنی اسرائیل میں روحانی زندگی کا صور پھونکنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ افسوس کہ بنی اسرائیل جو عرصۂ دراز سے ایک مسیحا کے منتظر تھے حضرت مسیح کی شکل میں جب انہیں یہ نعمت عظمی میسر آئی تو وہ اس موقع سے فائدہ تو کیا اٹھاتے الٹے انھوں نے مسیح اور ان کے حواریوں پر زندگی تنگ کر دی۔ بلکہ وہ تو اپنی دانست میں انہیں صلیب پر بھی چڑھا چکے۔

قرآن وفات مسیح کے بارے میں بہت زیادہ تفصیلات فراہم نہیں کرتا۔ البتہ ''رافعک'' کے لفظ سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام زندہ حالت میں آسمان کی طرف اٹھائے گئے ہیں اور اسی لئے ان کے دوبارہ نزول کے سلسلے میں خیال عام ہو گیا۔ ہمارے یہاں بعض مفسرین نے یہودی مآخذ سے استفادہ میں سادہ لوحی کا مظاہرہ کیا ہے۔ جس کے نتیجے میں عیسائی اور یہودی قصے کہانیوں کے ذریعے اہل کتاب کے بعض مذہبی عقائد اور تصورات ہمارے یہاں داخل ہو گئے ہیں۔ ہمارے خیال میں نزول

مسیح کا تصور بیرونی مآخذ سے برآمد کردہ خیال ہے۔ جس کی تفصیلات قرآن مجید کے اندر موجود نہیں ہے۔ اور نہ ہی قرآن سے ان تصورات پر استدلال ممکن ہے۔ جن لوگوں نے حضرت مسیح کے نزول کو اسلامی تصور حیات میں جگہ دینے کی کوشش کی ہے، ان کا خیال ہے کہ حضرت مسیح کی دوبارہ آمد امت محمدی کے ایک فرد کی حیثیت سے ہوگی۔ اور ان کا کام شریعتِ محمدی کا نفاذ ہوگا۔

بعض روایتوں کے مطابق مسیح کا ظہور دمشق میں مشرق کی جانب کسی سفید منارے کے قریب ہوگا۔ آپ مصری طرز کے دو زعفرانی حلے زیب تن کئے ہوں گے اور اپنے دونوں ہاتھ دو فرشتوں کے بازوؤں پر رکھے ہوئے تشریف لائیں گے۔ بالوں سے پانی کچھ اس طرح ٹپکتا ہوگا جیسے ابھی ابھی حمام سے باہر آئے ہوں۔ بعض روایتوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ آپ نکاح کریں گے اور آپ کی اولاد ہوگی۔ چالیس برس بعد مدینہ میں وفات پائیں گے۔ بعض لوگوں نے تو حضرت عمر کے پہلو میں بھی آپ کا دفن ہونا لکھا ہے۔ ابن ابی واصل کے مطابق شیعوں کے امام منتظر یعنی مسیح المسائح سے مراد آپ ہی کی ذات ہے۔ بعض صوفیاء بھی لامہدی الا عیسیٰ کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس قسم کے تصور کے عام ہونے میں بنیادی رول ان اطلاعات اور قصے کہانیوں کا ہے جو اصلاً عیسائی مآخذ سے آئے ہیں البتہ ہمارے یہاں کثرت نقل کی وجہ سے اب عام معلومات کا حصہ بن گئے ہیں۔ دوسری اور اہم تر وجہ یہ ہے کہ جو لوگ امت مسلمہ کے موجودہ زوال کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں ان کی یہ دلی خواہش ہے کہ ہم اپنے فکری انحراف کا ادراک کرنے کے بجائے کسی مسیح موعود کے انتظار میں بیٹھے رہیں۔

مؤطا امام مالک جو زمانی قربت کی وجہ سے حدیث کا مستند ترین مجموعہ ہے اس میں نزول مسیح سے متعلق کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ البتہ بخاری میں اس بارے میں دو روایات درج ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس میں حضرت مسیح کی وفات کا ذکر بھی موجود ہے۔ اس سلسلے کی پہلی حدیث کتاب بدء الخلق باب نزول عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام میں درج کی گئی ہے:

حدثنا محمد بن بشار حدثنا غُندر حدثنا شُعبةُ عن قتادة۔ وقال لي خليفة: حدثنا يزيد بن زُريع حدثنا سعيد عن قتادة عن ابي العالية حدثنا ابن عم نبيكم – يعني ابن عباس رضي الله عنهما – عن النبی ﷺ قال: "رأيتُ ليلةَ أُسرِيَ بِیٔ موسیٰ رجلًا آدمَ طُوالًا جعداً كأنه من رجالِ شنوءةَ، ورأيتُ عيسى رجلا مربوعا، مربوعَ الخلق الى الحمرة والبياض، سبط الرأس، ورأيتُ مالكاً خازنَ النار، والدجّال في آيات أراهنّ اللهُ اياهُ، فلا تكن في مرية من لقائه۔ قال أنس وأبوبكرة عن النبي ﷺ: تَحْرُسُ الملائكةُ المدينةَ من الدّجال۔"

(بحوالہ فتح الباری فی شرح البخاری ص ۳۶۲، کتاب بدء الخلق ج ۶، قاہرہ ۱۹۸۸)

دوسری حدیث دجال کے حوالے سے کتاب الفتن میں موجود ہے:

عن عبد اللّٰہ ابن عمر أن رسول الله ﷺ قال: بینا أنا نائم أطوف بالکعبة فاذا رجل آدمُ سبط الشعر ینطف– أو یهراقُ– رأسه ماء، قلتُ من هذا؟ قالوا: ابن مریم، ثم ذهبتُ ألتفت فاذا رَجُلٌ جَسیمٌ أحمرُ جعدَ الرأس أعورُ العین کأن عینه عنبة طافیة، قالوا: هذا الدجال، أقربُ الناس به شبهاً ابنُ قَطَنٍ رجل من خُزاعة۔" (فتح الباری بشرح البخاری، ص ۹۷، ج ۱۳)

مگر ان دونوں جگہوں پر نہ تو کہیں نزول عیسیٰ کا ذکر ہے اور نہ یہ کہ دجال کو عیسیٰ بن مریم ہی قتل کریں گے۔ صرف رسول اللہ کے ایک خواب کا تذکرہ ہے جس میں آپؐ نے عیسیٰ بن مریم کو دیکھا تھا۔ علمائے حدیث نے ان دونوں حدیثوں کو رجال کی بنیاد پر کمزور قرار دیا ہے اس سلسلے کی تفصیلی بحث علامہ تمنا عمادی نے ''انتظار مہدی و مسیح'' میں کی ہے۔ اس کے علاوہ متقدمین میں ابن خلدون نے اس نظریے پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔ اور تاریخی اصولوں کی بنیاد پر یہ ثابت کیا ہے کہ اس قبیل کی احادیث کا سماجی پس منظر کیا تھا اور انہیں کیوں معتبر قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اس بارے میں ایک حدیث عمرو بن عاص کے حوالے سے صحیح مسلم میں نقل ہوئی ہے اور اسی قبیل کی ایک اور حدیث جابر بن عبداللہ کے حوالے سے بھی صحیح مسلم میں ہے۔ اس کے علاوہ اس قبیل کی ایک حدیث ابوداؤد میں ابوصریحہ حذیفہ بن اُسید کے حوالے سے موجود ہے۔ ترمذی اور ابن ماجہ بھی اس قبیل کی حدیثوں سے خالی نہیں۔ ان تمام حدیثوں کے روایان کو مشترکہ طور پر دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کثرت روایت اور نقل کے باوجود ان کے طرق محدود ہیں اور ان کے روایان میں ایسے ناموں کا جابجا اندراج موجود ہے جنہیں علمائے حدیث ثقہ قرار نہیں دیتے۔

مسلمانوں نے اپنے زوال کے عہد میں ایک مسیحا کے انتظار میں اگر پناہ لی ہے تو اس کی ایک بڑی وجہ مسلسل پسپائی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفسیات ہے۔ جو لوگ آپسی خانہ جنگی سے پریشان ہو کر صرف اتحاد المسلمین کی خاطر بعض بڑے انحراف کو برداشت کرنے پر خود کو مجبور پاتے تھے، اور جن لوگوں نے بڑے بڑے اصحاب علم و فضل کی مسلسل مخالفت اور خروج کے باوجود خلافت کو دوبارہ منہاج النبوۃ پر قائم ہونے کے تجربے کی ناکامی دیکھ لی تھی۔ ان کے لئے ایک غیر معمولی اور عبقری شخصیت کے ظہور میں یقین کر لینا نفسیاتی طور پر کچھ مشکل نہ تھا۔ بالخصوص اگر اس نظریے کو کتاب وسنت کے لبادے میں پیش کیا گیا ہو۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہودی اور عیسائی روایتوں میں پہلے سے اس نظریے کو تقدس عطا کرنے کا وافر

سامان موجود تھا۔ ابتدائی عہد میں چوں کہ اسرائیلیات کو ایک مثبت اور معروضی علم کی حیثیت سے اضافی مآخذ کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ اس لئے ظہور مسیح کا عیسائی عقیدہ جب وقت کے تناظر میں پیش کیا گیا تو بہت کم لوگوں پر اس خیال کی غلطی واضح ہوسکی۔ پھر یہ کہ مسیحا کی آمد کا خیال اہل کتاب کی معلومات کے علاوہ ایرانی۔ ہندی مآخذ میں بھی پایا جاتا تھا۔ لہٰذا غیر عربی روایتوں سے جو لوگ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کے لئے اس تصور میں کوئی اجنبیت نہیں تھی۔ عیسائی مآخذ میں مسیح کی آمد ثانی سے متعلق اشاروں کا تذکرہ ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ میتھیو میں بڑی صراحت کے ساتھ حضرت مسیح کے بادلوں کے درمیان نزول کا تذکرہ موجود ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ آنے سے پہلے اپنے فرشتوں کو چہار دانگ عالم میں ندا لگانے کے لئے بھیج دیں گے۔ تاکہ ہر طرف سے ان کے مقربین ان کی آمد کے موقع پر جمع ہوسکیں۔ اسی قسم کی باتیں مارک 13/24 لوک 21/25 میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہودیوں کے مطابق آنے والے کا نام Imanual ہوگا۔ دانیال کے خواب کے مطابق وہ بھی بادلوں کے جلو میں آئے گا۔ جس کی آمد پر اہل یہود کی عظمت انہیں لوٹا دی جائے گی۔ یہودی عرصۂ دراز سے ایک ایسے جنگجو مسیحا کے منتظر تھے جو انہیں رومیوں کی غلامی سے نجات دلائے گا۔ گو کہ اب زمینی حالات بدل گئے ہیں۔ لیکن مسیحا کی واپسی کے تصور سے ابھی بھی یہودیوں کی جان نہیں چھوٹی ہے۔ زرتشت مذہب میں ساؤشیانٹ (Sao Shyant) بھی اسی قبیل کا ایک کردار ہے۔ جسے مادہ پرست دنیا میں روحانی زندگی کا احیاء کرنے کے لئے بھیجا جائے گا جو زرتشت کے مقابلے میں ایک عالمی مشن کا حامل ہوگا۔ کچھ اسی قسم کا تصور ہندوؤں میں کرشنا کے حوالے سے پایا جاتا ہے۔ بھگوت گیتا 4/78 اور وشنو پران 4/24 سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ کالی یگ میں جب دنیا ظلمتوں میں گھر جائے گی تب کرشنا دوبارہ نئے اوتار کی شکل میں ظہور پذیر ہوں گے۔

ہمارے خیال میں نزول مسیح میں عوام المسلمین کی دلچسپی اسی تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ علامہ ابن حزم نے الملل والنحل میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جو امت اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے معزول کر دی جاتی ہے وہ حسرت و یاس کے ساتھ اس امید کے ساتھ اپنے آپ کو مطمئن کرتی رہتی ہے کہ شاید کوئی ہستی نمودار ہو جو اس کے درد کا مداوا کر سکے۔ ایسی قومیں ذلت و پستی سے نکلنے کے لئے ایک مسیحا کی آس لگائے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی ہیں۔ عیسائیوں کے یہاں آخری زمانہ میں حضرت مسیح کا بادلوں کے جلو میں آسمان سے نزول کا عقیدہ یا اہل تشیع کے یہاں بارہویں امام کا ظہور اسی مایوسی پر دال ہے۔ امتِ مرحومہ کی نفسیات پر ازخود کچھ کرنے کے بجائے غیب سے آنے والے کا انتظار حاوی ہوتا ہے۔

۱۰ تلمود، ایوری مینس لائبریری سیریز، مرتب اے کوہن، ص ۳۰۴

۱۱ علامہ بغوی کی ان آراء کو شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب 'عقد الجید' میں تائیداً نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو شاہ ولی اللہ، عقد الجید (مترجم اردو) ترجمہ مولانا ساجد الرحمان صدیقی، کراچی ۱۳۷۹ھ، ص ص ۱۵-۱۱
عقد الجید میں مجتہد کے شرائط یوں بیان ہوئے ہیں: **وشرطه انه لابد له ان يعرف من الكتاب والسنة وما يتعلق بالاحكام ومواقع الاجماع وشرائط القياس وكيفية النظر وعلم العربية والناسخ والمنسوخ وحال الرواة۔** حوالہ مذکور ص ص ۱۰-۹

۱۲ کتاب فضائل القرآن، فتح الباری ج ۸، ص ۶۷۲، حدیث نمبر ۵۰۱۰

۱۳ ابوالحسن علی ندوی، تفسیر سورہ الکہف۔ نیز دیکھئے صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۷۶۶، انگریزی ترجمہ ص ۳۸۶، مطبوعہ دار العربیہ بیروت۔

۱۴ تفصیل کے لئے دیکھئے: ترجمہ قرآن مجید، مقدمہ از مولانا اشرف علی تھانوی، ص ۱۳-۱۵

۱۵ وحی ربانی تک راست رسائی کے خلاف مروّجہ عقائد نے کتنا سخت رویہ اختیار کیا ہوا ہے اس کا کسی حد تک اندازہ اس فتویٰ سے ہوتا ہے جو اہل سنت والجماعت کے ایک مؤقر دارالافتاء سے صادر ہوا ہے:

> ''یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق و تفتیش کا کام پہلی صدی، دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے، اسی کا نام فقہ اسلامی ہے جو ائمہ کی تحقیقات کا مجموعہ ہے۔ لہٰذا اگر تحقیقاتِ اسلامی سے ایسے موضوعات مراد ہوں جو مکمل اور تصحیح شدہ موجود ہیں تو موجودہ دور کی تحقیق اگر اس کے مطابق ہے تو بلا ضرورت ہے۔ اور اگر تحقیق اس کے خلاف ہے تو مردود ہے۔ اس پر امت محمدیہ کا اجماع ہے۔''

فتویٰ مفتی جمیل احمد تھانوی، جامعہ اشرفیہ لاہور، بحوالہ ایشیاء، ۱۴/اگست ۱۹۷۸ء۔

۱۶ Rabbi Yehiel ben Joseph, Quoted by Hyam Maccoby in *Judaism on Trial*, *Talmud Exposed*, at http://198.62.75.1/www3/talmud-exposed/talmud/htm

۱۷ "Moses received Torah from Sinai and delivered it to Joshua, and Joshua to the Elders, and the Elders to the Prophets; and the Prophets delivered it to the men of the Great Synagogue. These said three things; be deliberate in judging, and raise up many disciples, and

make a hedge around the Torah."

— The tractate 'Fathers' in the *Mishnah*.

And also see: 'Chapters of the Fathers' (Pirke 'Abot) tr. Herbert Danby, in the *Fathers according to Rabbi Nathen*. tr. from the Hebrew by Judah Goldin, Yale Univ. Press, 1955, p. 231.

۱۸ ابوحامد غزالی، المستصفٰی من علم الاصول، مطبوعہ مصر ۱۳۵۶ھ، ج ۲، ص ۳۵

۱۹ جیسا کہ توراۃ میں مذکور ہے:

And all the people perceived the Thunderings and the Lightnings and the Voice of the horn and the mountain smoking (Exodus Zo:18)

۲۰ تحریری تورات کے بالمقابل ربائی لٹریچر کی اہمیت مسلّم کرنے کے لئے یہاں تک کہہ دیا گیا کہ مذہب یہود کی تمام تر تعلیمات اور اس کی تشریحات کے مآخذ طُور پر ہونے والی 'روشنی' اور 'صدا' میں واقع ہیں:

Even what an outstanding disciple was destined to teach in the presence of his master had already been said to Moses on Sinai. (p. Peah 17a)

طور کی وحی پر انسانی تعبیرات نے اتنا سخت پہرہ بٹھا دیا کہ فی نفسہٖ وحی خمسہ موسوی کی اہمیت باقی نہ رہ گئی الا یہ کہ اسے وسعت دے کر بعد کے علماء ومشائخ کی فہم سے مطابقت دے دی جائے۔

When the Holy One, Blessed be He, revealed himself on Sinai in order to give the Torah the Israel, he delivered it to Moses in this order: the scriptures (the written Torah); the Mishnah, the Talmud, the Haggadah (which, taken together designate the Oral Torah). (Exodus Rabba 47, I)

۲۱ حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں "عن اسامة بن شریک قال خرجت مع رسول الله ﷺ حاجا فکان الناس یاتونه فمن قائل یا رسول الله! سعیت قبل أن اطوف أو أخرت شیئا أو قدمت شیئا فکان یقول لا حرج الا علی رجل افترض عرض مسلم وهو

ظالم فذلک الذی حرج وھلک"۔
مشکوٰۃ کتاب المناسک، ج۲، مطبوعہ دمشق ۱۹۶۱، باب ۹، فصل ۳، حدیث نمبر ۲۶۵۸، ص ۴۶

۲۲ تلمود، ص ۱۴۸

۲۳ روایت ہے کہ موسیٰ نے اپنے رب سے کہا: اے رب کائنات مجھے ہر مسئلے کے بارے میں حتمی احکام و فرامین سے آگاہی عطا کر۔

"Sovereign of the Universe! cause me to know what the final decision is on each matter of Law." He replied: "The majority must be followed when the majority declare a thing permitted it is permissible, when the majority declare it forbidden it is not allowed; so that the Torah may be capable of interpretation with forty-nine points *pro* and forty-nine point *contra*." (p. Sanh. 22a) Quoted in *Talmud*, p. 148.

۲۴ جس طرح اہل یہود نے تورات کے مفہوم اور وحی کے دائرے کو وسعت دے کر اس میں تعمیم، امور ائیم اور سوبورائیم کی ذہنی کاوشوں کو بھی شامل کر لیا تھا اور اسے من جانب اللہ سمجھ کر تقدس عطا کر دیا تھا، اسی طرح ہمارے یہاں بھی ائمہ اربعہ کی فہم کو دین مبین کی حفاظت کا من جانب اللہ انتظام سمجھا جاتا ہے۔ بقول شاہ ولی اللہ: "**فالمذھب للمجتھدین سرا لھمہ اللّٰہ تعالیٰ العلماء وجمعھم علیہ من حیث یشعرون أو لایشعرون**" یعنی مذہبِ مجتہدین کی پابندی ایک راز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے علماء کے دل میں ڈالا اور ان کو اس پر مجتمع کر دیا خواہ وہ اس کو جانیں یا نہ جانیں۔ (الانصاف مع الترجمہ، ص ۶۲)

علمائے اسلام کے نزدیک ائمہ اربعہ کو منبع تقلید بنانا نہ صرف یہ کہ اتفاقی بلکہ ایک الہامی امر ہے۔ ان کے علاوہ کسی اور کی تقلید گوارہ نہیں۔ علامہ طحاوی حاشیہ درمختار میں لکھتے ہیں: "**من کان خارجاً عن ھذہ الاربعة فھو من اھل البدعة والنار۔**"

۲۵ تلمود، ص ص ۱۵۵-۱۵۴

۲۶ ابوحامد محمد الغزالی، کیمیائے سعادت، ترجمہ محمد سعید الرحمٰن علوی، ص ۴۵۸

۲۷ ایضاً، ص ۴۶۰

۲۸ تلمود، ص ۱۷۹

۲۹ تورات کی تلمودی تعبیر نے یہودی فقہ میں سخت اختلافات پیدا کر دیے۔ یہ وہی عمل تھا جو خلفائے راشدین کے عہد میں روایات کے بیان سے شروع ہو گیا تھا اور جس کی وجہ سے حضرت عمر نے روایت گوئی پر سخت پابندیاں عاید کر دی تھیں۔ مشناۃ میں حلل (Hillel) اور شمائی (Shammai) کے اختلاف نے عام قارئین کو بڑے مخمصے میں ڈال دیا۔ عام لوگوں کے لئے یہ فقہی اختلاف سخت پریشانی کا باعث ہوئے۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لئے Sadducees تحریک اٹھ کھڑی ہوئی، جس نے وحی کے گرد اس انسانی حصار کو توڑنے کی بھرپور کوشش کی۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ تحریری تورات کے علاوہ اور کسی زبانی روایت کی کوئی اہمیت نہیں، لیکن فقیہوں کے بھاری بھرکم ناموں کے آگے اسے کامیابی نہ مل سکی۔ Pharisaic کوششوں کو نہ صرف یہ کہ جمہور عقیدے کی حیثیت حاصل ہو گئی بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ خدا نے موسیٰ پر مکمل بائبل نازل کیا۔ تلمود اور مدرش نازل کیا یہاں تک کہ ان تمام سوالات کے جواب بھی جو کوئی سنجیدہ طالب علم رہتی دنیا تک پوچھے گا، اس کے جواب منزل من اللہ تسلیم کئے جائیں گے۔ دلیل یہ دی گئی کہ نہ صرف یہ کہ زبانی تورات منزل من اللہ ہے بلکہ تشریح و تعبیر کے تمام طریقہ کار بھی ذریعہ سماوی سے ہم تک پہنچے ہیں۔ تحریری تورات تو یہ ایک منجمد شی ہے جسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا، لیکن زبانی تورات ان ہی سماوی اصولوں کی روشنی میں مستقل نمو پذیر ہے۔ آرتھوڈکس یہودیت نے اس اصول کو تسلیم کر کے گویا تورات کو اپنی من مانی تعبیرات و خواہشات میں ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا۔

۳۰ تلمود، ص ۱۶۹

۳۱ Deuteronomy, 24:1, Revised Standard Version, Quoted in *Judaism*, C.M. Pilkington, London 2000, p.35.

۳۲ ایضاً ص ۳۵

۳۳ کتاب خروج، باب ۱۹، ۱-۶

۳۴ C.M. Pilkington, op.cit., p.21

۳۵ متی باب ۲۳، آیات ۲۳-۲۸

۳۶ کتاب عموس، باب نہم، آیت ۱-۴

۳۷ حدیث کے اصل الفاظ یوں ہیں:

''ما من عبد قال لاالٰہ الا اللہ ثم مات علی ذلک الا دخل الجنۃ قلت:

وإن زنى وان سرق قال: وان زنى وان سرق قلت: وإن زنى وإن سرق؟ قال: وإن زنى و ان سرق۔ قلت: وإن زنى وإن سرق؟ قال: وان زنى وإن سرق۔ على رغم انف أبي ذر۔''

(متفق علیہ) مشکوٰۃ المصابیح مع انگریزی ترجمہ ج۱،ص۱۰۴

۳۸ عبدالباری، تجدید دین کامل، لکھنو ۱۹۵۶ء، ص ۹۸

۳۹ دیکھئے بخاری، کتاب الصلوۃ

۴۰ تفصیلات کے لئے دیکھئے: فتح الباری، ج ۱۳، کتاب التوحید، باب ۱۹، حدیث نمبر ۷۴۱۰، ص ۴۰۳۔ مسلم، کتاب الایمان، حدیث نمبر ۳۳۲، ۳۲۶ تا ۳۲۹۔ ترمذی، کتاب التفسیر، سورہ ۱۷، حدیث ۱۹۔ مسند احمد ۱:۴

(محولہ دائرۃ المعارف، ص ۷۵۲، ج ۱۱)

۴۱ ترمذی، کتاب الصفة القيامة والرقائق والورع، باب ۱۳

۴۲ محولہ محمد حسین شاہ علی پوری، افضل الرسل، کراچی، ۱۹۹۲ء، ص ۷۵

۴۳ علامہ نورالدین حلبی، انسان العیون، محولہ ایضاً، ص ۷۶-۷۷

۴۴ ایضاً، ص ۷۷

۴۵ ایضاً ص ۱۴۱

☆ ☆ ☆